www.shibliinternational.com November 2019

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

علامہ شبلی نعمانی

مولانا ابوالکلام آزاد

علامہ اقبال

مولانا اسماعیل میرٹھی

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

نومبر:Nov:2019
علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار
جلد Vol2۔شمارہ: Issue21

ماہنامہ
حیدرآباد
صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 150 -بیرونی ممالک:50/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:1000

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
IFSC CODE: IBKL0001327
IDBI BANK, CHRMINAR HYD, TS

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکرِ شبلی کا مطالعہ (قسط:۱۸)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۸
۴	قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے کا بنیادی تقاضہ	مولوی صفوۃ الرحمٰن	۱۱
۵	شاعر مہر و ماہ: مسعود عابد	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	۱۳
۶	نعت شریف	ڈاکٹر مسعود جعفری	۱۶
۷	شبلی خود نوشتوں میں: ایک مطالعہ	حکیم وسیم احمد	۱۷
۸	مولانا ابوالکلام آزاد کا تفسیری امتیاز	محمد قاسم	۲۳
۹	پیغام آفاقی کے ناول 'دوست' کا تجزیاتی مطالعہ	شیخ شہباز	۲۶
۱۰	اقبال فہمی	احمد نور عینی	۲۹
۱۱	غزل	ظہور ظہیر آبادی	۳۰
۱۲	سرسید اور ان کے نامور رفقا: ایک جائزہ	شہزاد اختر	۳۱
۱۳	ایک غلطی (افسانہ)	ابینا ز جان علی	۳۵
۱۴	نعت رسولؐ	محمد زاہد ہریانوی	۴۰
۱۵	قارئین کے خطوط	ڈاکٹر جرار احمد	۴۰
۱۶	لفظوں کا لہو (تبصرہ)	عبدالمنان صمدی	۴۱

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج
چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبد القادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔
الحاج **محمد قمر الدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اداریہ

انصاف ہو کیسے کہ دل صاف نہیں ہے　　دل صاف ہو کیسے کہ انصاف نہیں ہے

مسلمانوں کے پاس مسجد کی کمی نہیں ہے اور نہ ہی ہندوؤں کے پاس مندر کی کمی ہے، ان دونوں فریق کو نہ زمین کی تلاش ہے اور نہ ہی اس کی طلب، فریق ثانی کا دعویٰ ہے کہ بابری مسجد کے گنبد میں رام کی پیدائش ہوئی اور اس دعوے پر ان کے لیے نہ داخلی نہ خارجی شہادت موجود ہے۔ مسلمانوں کا کہنا یہ ہے کہ مسجد بابر کے دور میں سپہ سالار میر باقی کے نگرانی میں ۱۵۲۸ء میں جائز طریقے سے بنائی گئی اور اس میں مسلمان مسلسل عبادت کرتے چلے آرہے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں کچھ شر پسندوں نے رات کے اندھیرے میں مورتیاں رکھیں۔ حالات کے دگرگوں ہونے کی وجہ سے مسجد میں تالا مار دیا گیا۔ اس کے بعد سیاستدانوں کی سازش کی وجہ سے تالا کھولوایا گیا اور انہیں کے اشارے سے بابری مسجد کو ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء میں دن کے اجالے میں شہید کر دیا گیا۔ اس وقت کی حکومت نے اور پوری دنیا کی عوام نے شہادت پر افسوس کا اظہار کیا اور اس وقت کے وزیر اعظم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہم دوبارہ اسی طرح کی مسجد بنوا کر مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔ وقت کی رفتار گزرتی چلی گئی۔ ۲۰۱۰ء میں ہائی کورٹ نے مسجد کو تین فریقوں کے درمیان تین حصے میں بانٹ دیا، تاکہ ہر فریق خوش ہو جائے لیکن اس بٹوارے پر کوئی بھی فریق خوش نہیں تھا۔ یہ مسئلہ سپریم کورٹ میں پہنچ گیا اور طرفہ تماشہ یہ رہا کہ جو لوگ مسجد کو توڑنے والے یا مدد کرنے والے تھے، انہوں نے اس مسئلے کو اتنا اچھالا کہ دو مذاہب کے درمیان نفرت بیٹھ گئی اور اسی مسئلے کو لے کر وہ اقتدار کی کرسی پر براجمان ہو گئے۔

سپریم کورٹ نے اس مسئلے میں دلچسپی دکھائی اور اخیر مرحلے میں اس مسئلے پر چالیس دن لگاتار شنوائی کی، اس کے بعد ۹ر نومبر ۲۰۱۹ء کو ساڑھے دس اور گیارہ بجے دن میں سارے ثبوتوں اور شواہد کو بابری مسجد کی حقیقت تک پہنچانے کے بعد فیصلہ اکثر ہندوؤں کے من موافق کر دیا۔ فیصلہ آنے سے قبل میڈیا کے سبھی چینلوں نے ملک کے بڑے بڑے ہندو اور مسلمان مذہبی پیشواؤں سے یہ عہد لیا کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ جو بھی آئے ہم اسے بسر و چشم منظور کر لیں گے۔ فیصلہ آیا مگر وہ فیصلہ دلائل و شواہد کے خلاف تھا، جس میں عدل کا خون ہوتا ہوا دیکھائی دے رہا رہے، اس وجہ سے مسلمان سکتے میں آ گئے اور امن کی وجہ سے صبر کی تلقین کرنے لگے، جسے ہندوستان کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ، جمعیت علماء اور جن لوگوں نے مسلسل اس مقدمے میں پیروی کی اور اخیر تک ہار نہیں مانی، دنیا کے سارے وسائل استعمال کرنے کے بعد وہ مایوس ہوئے انہیں ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے مسلمان ان کی استقامت اور ہمت کو سلام کرتے ہیں، کیونکہ ان لوگوں نے اپنی کوششوں کے ذریعہ امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا اور امید ہے کہ امت عند اللہ غیر مسئول رہے گی۔ ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد بابری مسجد کی بازیابی میں کوشش کرنے والے تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ بالخصوص رکن پارلیمنٹ حیدرآباد عالی جناب بیرسٹر اسد الدین اویسی صاحب کی جرأت کو سلام کرتا ہے۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سکندر علی وجد کہتے ہیں ۔

پھول مرجھا جائے تو کیا غم ہے　　کھلنے والی کلی کی بات کرو

یوم تعلیم کے موقع پر اردو اکیڈمی تلنگانہ و آندھرا پردیش کی جانب سے تمام ایوارڈ یافتگان کو ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد مبارکبادی پیش کرتا ہے۔ دونوں اکیڈمیوں کے چیرمین مولانا رحیم الدین انصاری اور ڈاکٹر محمد نعمان شکریے کے مستحق ہیں۔

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

آپؐ راتوں کو اٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی رات کی یہ عبادت ترک نہیں کی، اگر کبھی مزاجِ اقدس ناساز یا سست ہوا تو بیٹھ کر ادا کرتے تھے، جریر بن عبداللہؓ ایک صحابی ہیں، جن کو دیکھ کر آپؐ محبت سے مسکرا دیا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں اور آپؐ نے مسکرا نہ دیا ہو۔

جس کام کے کرنے کا جو وقت آپؐ نے مقرر کر لیا تھا، اس میں کبھی تخلف نہ ہوا، نماز اور تسبیح وتہلیل کے اوقات، نوافل کی تعداد، خواب اور بیداری کے مقررہ ساعات، ہر شخص سے ملنے جلنے کے طرز وانداز میں کبھی فرق نہ آیا اور اب وہی مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہے)

حسنِ خلق: (حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ وغیرہ جو مدتوں آپؐ کی خدمت میں رہے تھے، ان سب کا متفقاً بیان ہے کہ آپؐ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نکو سیرت تھے، آپؐ کا چہرہ ہنستا تھا، وقار متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے)

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپؐ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود نہ منہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا، یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپؐ کے زانوں کو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔

اکثر نوکر چاکر، لونڈی، غلام، خدمت اقدس میں پانی لے کر آتے کہ آپؐ اس میں ہاتھ ڈال دیں تاکہ متبرک ہو جائے، جاڑوں کے دن اور صبح کا وقت ہوتا، تاہم آپؐ کبھی انکار نہ فرماتے۔

ایک دفعہ آپؐ سعد بن عبادہؓ سے ملنے گئے، واپس آنے لگے تو انہوں نے صاحب زادہ قیسؓ کو ساتھ کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کہ ہم رکاب جائیں، آنحضرت ﷺ نے قیسؓ سے کہا تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہو لو، انہوں نے بے ادبی کے لحاظ سے تامل کیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ یا سوار ہو لو یا گھر واپس جاؤ، وہ واپس چلے آئے۔

ایک نجاشی کے ہاں ایک سفارت آئی، آپؐ نے اس کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور خود بہ نفس نفیس مہمان داری کے تمام کام انجام دیئے، صحابہؓ نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دیں گے، ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گذاری کی ہے، اس لیے میں خود ان کی خدمت گذاری کرنی چاہتا ہوں۔

عتبانؓ بن مالک جو اصحاب بدر میں تھے، ان کی بینائی میں فرق آ گیا تھا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر درخواست کی کہ میں اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں لیکن بارش ہو جاتی ہے تو مسجد تک جانا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے اگر آپؐ میرے گھر تشریف لا کر نماز پڑھ لیتے تو اسی جگہ سجدہ گاہ بنا لیتا، دوسرے دن صبح کے وقت آپؐ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئے اور دروازہ پر ٹھہر کر اذن مانگا، اندر سے جواب آیا تو گھر میں تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ انہوں نے جگہ بتا دی، آپ نے تکبیر کہہ کر دو رکعت نماز ادا کی، نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کے لیے اصرار کیا، خزیرہ ایک کھانا ہوتا ہے قیمہ پر آٹا چھڑک کر تیار کرتے ہیں، وہ سامنے آیا، محلہ کے تمام لوگ کھانے میں شریک ہوئے، حاضرین میں سے کسی نے کہا، مالک بن دخشن نظر نہیں آتے، ایک نے کہا وہ منافق ہے، ارشاد فرمایا یہ نہ کہو، وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں، لوگوں نے کہا ہاں ان کا میلان منافقین کی طرف ہے، آپؐ نے فرمایا جو شخص خدا کی مرضی کے لیے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس پر آگ کو حرام کر دیتا ہے۔

قسط:(۱۸)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور (۱۹۱۱-۲۰۰۲ء) نے علامہ شبلی پر کئی جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ ایک مضمون ''شبلی میری نظر میں'' ایک تبصرہ ایک تبصرہ ''حیات شبلی'' پر اور ایک مقدمہ عبداللطیف اعظمی کی کتاب ''مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' پر لکھا ہے۔ آل احمد سرور نے شبلی کے کارناموں اور ان کے افکار کا جائزہ بڑی گہرائی اور باریک بینی سے لیا ہے اور تقریباً تمام پہلوؤں پر بڑا منصفانہ تجزیہ کیا ہے۔ طویل مقدمہ کے چند خاص پہلوؤں اور سرور صاحب کی چند منفرد رایوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ مقدمہ کا آغاز ان لفظوں سے کرتے ہیں:

''شبلی پر لکھنے کے لئے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں، وہ ہماری ذہنی زندگی کے معماروں میں ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کے چالیس سال علمی کاموں میں بسر کئے انھوں نے بہت سے عملی کام بھی کئے اور ان میں کامیابی بھی حاصل کی مگر وہ محض اپنے عملی کاموں کی وجہ سے شاید اتنے مشہور نہ ہوتے اگر ان کاموں کے پیچھے ایک مسلسل، اہم اور پرزور علمی وذہنی تحریک نہ ہوتی۔ مہدی افادی نے انھیں تاریخ کا معلم اول کچھ غلط نہیں کہا ہے۔ انھوں نے اردو میں تاریخی ذوق پیدا کیا، خود بڑی اچھی سوانح عمریاں اور تاریخیں لکھیں اور تحقیق وتدقیق واقعات کی چھان بین اور مآخذ کی تلاش اور تاریخ میں ایک صاف اور واضح نقطہ نظر ان سب کی اہمیت دکھائی اور جتائی۔ انھوں نے ادب، سیاست، تعلیم، مذہب، فلسفہ سب کو متاثر کیا اور سب پر اپنا کچھ نہ کچھ نقش چھوڑا۔ وہ بڑی جامع اور ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو متن کا دامن بہت وسیع کیا اور اسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نظم میں بھی اپنی رنگینی، پرجوش اور مزے دار، سیاسی اخلاقی اور تاریخی نظموں سے ایک خوش گوار اضافہ کیا۔ ان کے اسلوب میں ایک شگفتگی، بانکپن اور چستی ملتی ہے۔ شبلی کے یہاں عالمانہ شان ہے مگر خشکی نہیں، شبلی زاہد خشک نہیں تھے وہ شاعر بھی تھے''۔ (مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ص ۱-۲)

ایک زمانہ میں حالی وشبلی کا موازنہ عام بات تھی اور اس پر اہل قلم نے خوب طبع آزمائی کی، کسی نے حالی کو بڑھایا تو کسی نے شبلی کو، کسی نے حالی کی کسی خوبی کا ذکر کیا تو کسی نے شبلی کی عظمت بیان کی۔ آل احمد سرور نے اسے ناپسندیدہ طرز عمل قرار دیا ہے اس کا آغاز مہدی افادی کے مضمون حالی وشبلی کی معاصرانہ چشمک سے ہوا۔ سرور صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے اور پھر اسے نہ صرف غلط طرز عمل قرار دیا ہے بلکہ شبلی کے اقتباسات اور خیالات سے ان کے دل میں حالی کی جو عظمت تھی بیان کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شبلی نے ان کی تمام تصانیف کی تحسین وستائش کی سوا حیات جاوید کے۔ اس میں بھی شبلی کو مصور پسند تھا اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر پسند نہ تھی۔ (ایضاص ۴)

شیخ اکرم نے اپنی کتاب میں شبلی کو سرسید کا حریف بنا کر پیش کیا ہے۔ سرور صاحب نے ان کو نقل کر کے لکھا ہے کہ:

''ان حوالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر چشمک تھی تو سرسید اور شبلی کی تھی، اس پر میں ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں،

کیوں کہ شیخ اکرام نے شبلی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ انھوں نے سطح پر اختلافات کو دیکھا ہے اور یہ نظر انداز کر دیا ہے کہ اس کے وجوہ کس قدر گہرے، بنیادی اور اساسی تھے"۔ (ایضاص ۵)

پھر انھوں نے مذکورہ بنیادی اور اساسی وجوہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شبلی کو شبلی سرسید نے بنایا، شبلی مغرب تک سرسید کے واسطے سے پہونچے، سرسید کے کتب خانے، ان کی صحبت، علی گڑھ کی علمی صحبتوں اور آرنلڈ کی رفاقت نے شبلی کو ایک نیا ذہن اور ایک نیا مزاج دیا، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی سخت حنفیت سرسید کے اثر سے اعتزال اور عقلیت میں تبدیل ہوگئی، لیکن ایک زمانہ وہ آتا ہے جب سرسید کی ذہنی قیادت پیر تسمہ پا کا کام کرتی ہے اور شبلی اس سے آگے بڑھ جاتے ہیں، شبلی نے سرسید کی تعریف میں صبح امید لکھی لیکن ان کی سوانح لکھنے سے صاف انکار کر دیا، پھر ان کے مرنے پر صرف اردو ادب پر ان کے احسانات بیان کئے اور کچھ نہ لکھا، حالی بھی ایک زمانے میں حیات جاوید لکھنے کا ارادہ ترک آچکے تھے"۔

(ایضاص ۵۔۶)

عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ شبلی سرسید کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہونا گوارا نہیں کرتے تھے، انھیں خود قیادت کی ہوس تھی، اس کے بارے میں سرور صاحب نے لکھا ہے کہ:

"میرا خیال ہے شبلی جس دبستان کے فرد تھے وہ سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود سرسید کی ہر معاملے میں تقلید اور ہمنوائی نہیں کرسکتا تھا۔ شبلی محسن الملک نہ تھے جو سرسید کے سجادہ نشین ہونا چاہتے ہوں، وہ سرسید کے جانشین ہو بھی نہیں سکتے تھے"۔

بات یہ تھی کہ شبلی پرانے اسکول کا وہ ستارہ تھے جو اپنی فضا سے ٹوٹ کر سرسید کی دنیا میں پہونچ گیا تھا مگر اپنی دنیا کی چیزیں بھی ساتھ لیتا گیا تھا۔ شبلی قدیم علوم کے فاضل تھے، سرسید نہ تھے۔ شبلی نے جس گہوارے میں تربیت پائی تھی وہ کچھ زیادہ سرکار پرست نہ تھا، سرسید مغرب و مشرق کے ملاپ کی خاطر سرکار پرست بنے تھے، یہ ان کا نئی نسل پر بہت بڑا احسان ہے، وہ اس دور کے بانی اور راہنما ہیں، ان کی تحریک سے ہماری مردہ زندگی میں کتنی زندگی پیدا ہوئی اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، لیکن ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۷ء میں کچھ فرق ہونا چاہئے تھا۔ سرسید کی سیاسیات اس فرق کو نمایاں کرنے کے خلاف تھے"۔ (ایضاص ۶۔۷)

سرور صاحب نے سرسید اور شبلی کے مزاج اور فکر و نظر کے اختلاف کے طویل تجزیے کے بعد لکھا ہے کہ:

"سرسید انگریزوں کے بڑے مداح اور انگریزی طریقہ حکومت کے بہت بڑے طرفدار تھے۔ شبلی انگریز پرستی سے چڑھتے تھے۔ سرسید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی آخر عمر کی سیاست سے جب وہ بیک صاحب کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ شبلی سرسید کی لائف اس لئے نہ لکھ سکتے تھے کہ وہ سرسید سے کچھ آگے دیکھ رہے تھے۔ سرسید کا دور علی گڑھ تحریک کا پہلا دور ہے، شبلی کا دوسرا۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے"۔

شبلی نے علی گڑھ کو چھوڑا اور ندوے کی دنیا آباد کی۔ یہ محض خودسری نہ تھی ایک سنجیدہ مقصد اس کی تہ میں تھا۔ (ایضاص ۷)

طویل تجزیے کے بعد سرور صاحب اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ:

"سرسید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ علمی جد وجہد، تصنیف و تالیف، ذہنی قیادت، تہذیبی کوششیں، نئی نسل کے مقابلے میں شبلی اور ان کے

ساتھیوں کی طرف سے زیادہ ہوئیں، سرسید نئی نسل کو ہندوستان کی قیادت سپرد کرنا چاہتے تھے، یہ خیال غلط نہ تھا، لیکن انھوں نے نئی نسل کی صحیح تربیت پر توجہ نہ کی اور انھیں سرکاری ملازمت کی طرف ڈھکیل دیا۔ شبلی نئی نسل (انگریزی خواں طبقہ) سے مایوس تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر علماء کو حریت پسند اور روشن خیال بنایا جائے تو قوم کی وہ بہتر قیادت کرسکیں گے، خیال برا نہ تھا، لیکن علماء کی تنگ خیالی نے ندوے میں شبلی کو کامیاب نہ ہونے دیا"۔ (ایضاص۹)

پھر سرور صاحب نے اثرات شبلی کا ذکر کیا ہے اور صراحت سے لکھا ہے کہ:

"شبلی کا اثر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ہوا۔ حالی نے اردو ادب کی دنیا بدل دی مگر شبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالا، انھیں اپنی چیزوں کی قدر کرنی سکھائی، انھیں ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک کے مسائل کو محسوس کرنے کا عادی بنایا، ان میں حقوق کی طلب اور خوشامدانہ سیاست سے بلندی پیدا کی۔ سید سلیمان، ابو الکلام، عبدالسلام ندوی، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، اقبال، سب پر سرسید سے زیادہ شبلی کا اثر ہے۔ اکرام نے یہ غلط نہیں لکھا کہ نئی نسل سرسید سے زیادہ شبلی سے متاثر ہے۔ یہ اثر قدرتی تھا"۔ (ایضاص۹)

بعد ازاں سرور صاحب نے سرسید اور سرسید تحریک اور شبلی کے غور وفکر کے انداز اور طریقہ کا موازنہ کیا ہے۔ سرسید کی آخری زمانہ کے سیاسی فکر کی وضاحت کی ہے اور انھوں نے ماحصل کے طور پر لکھا ہے کہ:

"غالباً اب یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ شبلی کی تحریک سرسید کی ضد نہیں تھی بلکہ اس کے ایک خاص رجحان کی اصلاح کرکے اس کی روح کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔

(ایضاص۱۱)

اس کے بعد سرور صاحب نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ علماء نئے مسائل کو سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے اور انھوں نے شبلی کی روشن خیالی سے فائدہ نہیں اٹھایا، البتہ وہ نئی نسل جن سے شبلی خود مایوس تھے، اس نے شبلی سے زیادہ استفادہ کیا۔ وہ نئی نسل پر شبلی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شبلی کے اثر سے نئی نسل میں اپنی تہذیبی میراث کا احترام آیا اور سستی مغربیت سے بیزاری۔ انھیں کے اثر سے مسلمانوں کی سیاست میں ترقی پسند اور حریت پسند عناصر پیدا ہوئے۔ انھیں کے اثر سے نیا نوجوان ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کو خون کی ہولی سمجھنے کے بجائے اسے اصلی رنگ میں دیکھنے لگا۔ ان کی علمی تصانیف سے اس کے ذہن کو جلا ہوئی، ان کی نظموں کی چاشنی نے غیر محسوس طور پر اسے کچھ سیاسی اور سماجی قدریں عطا کیں۔ وہ انھیں کے سہارے ترکوں کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ اسلام کی ابتدائی سادگی، خلوص اور جوش سے آشنا ہوا اور اپنے زمانے کے ہنگاموں اور معرکوں کو ایک بڑے سانچے اور ادارے کا جز بنا کر دیکھنے لگا۔ مسجد کان پور، شہر آشوب اسلام، ڈاکٹر انصاری کی واپسی، جنگ عظیم، لیگ سے خطاب، خطاب بہ احرار میں آج بھی وہی تازگی ہے جو ان کی تصنیف کے وقت تھی۔ سرسید کے جانشین مسلمانوں کو انگریز پرست بنا رہے تھے، شبلی نے انھیں روکا۔ شبلی کے بعد محمد علی، ابو الکلام اور اقبال نے نظم ونثر کے ذریعہ سے انگریز پرستی کا سد باب کیا اور آج چند ارباب غرض کے سوا مسلمانوں میں انگریز پرستی عام نہیں"۔ (ایضاص۱۱-۱۲)

اس طرح سرور صاحب نے انتہائی معروضی انداز میں سرسید اور شبلی کے متعلق تمام اعتراضات اور الزامات کا تجزیہ کرکے واضح کردیا کہ شبلی علی گڑھ تحریک کے مخالف نہیں تھے بلکہ

انھوں نے ایک نئے رجحان کے ذریعہ اس تحریک کی کمیوں کا ازالہ کیا، خاص طور پر سرسید کے آخری دنوں میں جوان کا سیاسی نقطۂ نظر تھا، اس سے شبلی نے اختلاف کر کے جو نیا نظریہ پیش کیا وہ نہ صرف نئی نسل کے لئے بلکہ قومی مفادات کے لحاظ سے بھی مفید تھا۔

سرور صاحب نے حالی وشبلی کی سوانح نگاری کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ

''شبلی نے سوانح نگاری کے ان اصولوں پر اعتراض کیا تھا جو حالی نے برتے، حالانکہ شبلی نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں قریب قریب وہی اصول مدنظر رکھے گئے ہیں۔شبلی حالی سے زیادہ تحقیق وتلاش، واقعات کی چھان بین، مواد کی ترتیب وتہذیب پر زور دیتے ہیں۔حالی کے نزدیک شخص اہم نہیں تھا۔ .....سوانح نگار کی حیثیت سے وہ حالی سے بلند نہیں کہے جاسکتے، وہ حالی کی طرح غیر جانب دار اور غیر شخصی بھی نہیں کہے جاسکتے، ہاں حالی سے زیادہ تفصیل پیش کر سکتے ہیں اور زیادہ وسعت پیدا کر سکتے ہیں''۔(ایضاص ۱۲۔۱۳)

شعرالعجم اور موازنہ انیس ودبیر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

وہ بڑے اچھے محقق تھے اور خالص ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند ہے۔اگرچہ شیرانی نے ان کی شعرالعجم کی بعض غلطیوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اگرچہ موازنہ انیس ودبیر دراصل موازنہ نہیں ہے مگر پھر بھی شبلی کے فیصلے اکثر وبیشتر صحیح اور ان کی تنقیدیں زیادہ تر پاکیزہ اور اچھے ادبی ذوق کی ترجمان ہیں''۔

(ایضاص ۱۳)

خطوط شبلی کے بارے میں لکھا ہے کہ

''شبلی کے خطوط میں ان خطوط کو خواہ مخواہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے جو انھوں نے عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کو لکھے تھے۔در اصل ''مکاتیب شبلی'' ان کی علمی وادبی زندگی کی بہتر ترجمانی کرتے ہیں۔(ایضاص ۱۴)

سرور صاحب نے مقدمہ کے آغاز میں حالی وشبلی کے موازنہ کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور مہدی افادی کے مضمون حالی وشبلی کی معاصرانہ چشمک پر بھی معترض ہیں، مگر انھوں نے خود حالی وشبلی کی شاعری کا موازنہ کیا ہے اور جن نقادوں نے شبلی کی شاعری کی برتری دکھلائی ہے ان سب پر تنقید نہیں کی ہے بلکہ ان کے نقطہ نظر کو مسترد کر دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ لطیف طنزیہ نظمیں لکھنے کا سہرا مولانا شبلی کے سر ہے۔یہ بات کسی طرح مانی جاسکتی ہے کہ حالی کی شاعری شبلی کی شاعری کے مقابلہ میں پھیکی اور کم رتبہ ہے اور یہ کہنا بھی خوش فہمی ہے کہ اگر شبلی اپنی تمام تر قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری کے لئے وقف ہوجاتے تو وہ اگر دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ شبلی کی شاعری جوان کی شگفتہ، لطیف اور رساطبیعت کا کبھی کبھی کا ابال ہے اپنے رس اور شعریت کے ساتھ ساتھ اچھی اور صالح سماجی قدروں کی بھی علمبرداری کرتی ہے۔شبلی کے یہاں تغزل ہے اور یہ تغزل محض گل وبلبل کی حکایت یا جوانی دیوانی کی داستان کے لئے نہیں، ملک وقوم کے مسائل اور تاریخ کے اوراق کی تشریح کے لئے استعمال ہوا ہے''۔(ایضاص ۱۵)

آخر میں سرور صاحب نے شبلی کی معنویت اور علماء میں روشن خیالی کے خاتمہ پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں

''افسوس ہے کہ علماء میں شبلی جیسے روشن خیال اور دور بین اشخاص کم ہوئے ہیں۔اس سے علماء کو بھی نقصان پہونچا ہے اور ہندوستان کو بھی اور اب شاید ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی ذہنی زندگی کی قیادت ان سے چھن گئی''۔(ایضاص ۱۶)

مولوی صفوۃ الرحمٰن صابرؔ۔ حیدرآباد

قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے کا بنیادی تقاضہ

اہل تصوف اور علماء نے سیرۃ النبیؐ، میلاد النبیؐ کے جلسے جلوس، درود کی مجالس، ختم قرآن، ختم بخاری، ختم خواجگان، ختم حصن حصین، آیت کریمہ کے دسترخوان، یادفلاں، یوم فلاں منانے کو تبلیغ واشاعت دین کا ذریعہ سمجھ کر خوش ہیں کیونکہ ان کی اکثریت ان اعمال کو حل المشکلات، دافع بلیات کا نسخۂ مجرب سمجھتی ہیں، آیت کریمہ کے ورد کرنے والوں کی یہ حجت کہ اس کے پڑھنے سے جب یونسؑ کو مصیبت سے نجات ملی تو ہم بھی اسی لیے اس آیت کا ورد کررہے ہیں، پھر ایسا کرنے سے منع کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے، یہ جواب دین سے جہل وہٹ دھرمی کا منھ بولتا ثبوت ہے کیونکہ آیت کریمہ کے الفاظ ادا کرنے میں کوئی اثر نہیں بلکہ ہر قسم کی قوت وطاقت کا مالک تو صرف اللہ ہی ہے، دوسرے یونسؑ اپنی کی ہوئی غلطی کا اعتراف اور اس پر ندامت کا اظہار ان الفاظ کے ذریعہ کئے ہیں جو کہ رب ہی نے انہیں سکھایا ہے، تب ہی اللہ نے آپ کی توبہ کو قبول فرما کر مچھلی کے پیٹ سے نجات دی، اس کے برخلاف ورد کرنے والے بوقتِ ورد بھی بلحاظ وضع قطع، لباس، عقائد واعمال کی برائیوں میں لت پت رہتے ہوئے اس آیت کریمہ کا ورد کرتے رہتے ہیں جو اللہ کی آیات کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے، حالانکہ یہ اعمال صرف ایصال ثواب ہی کے لیے نہیں بلکہ حلِ مشکلات اور دافعِ بلیات کے لیے انجام دیئے جارہے ہیں۔

دنیا دارالاسباب میں جادو، نظر بد، تعویذ، گنڈہ، نقش، جھاڑ پھونک، سایہ سپٹ، چھلے وکڑے، اشیاء، مقام، ساعت، دن، نحوست وبرکت کے تحت اور پھر شب معراج، شب برأت، شب قدر، رمضان کا مہینہ، دسویں محرم بے حد اہم مبارک مانے جاتے ہیں، چنانچہ دسویں محرم کو روز رکھنا بڑا ہی نیکی کا کام سمجھا جاتا ہے، ہدایت وگمراہی کو قسمت کی بات مانتے ہیں، سمع موتی کے قائل ہیں، ہر کام کا افتتاح مرشد کے مبارک ہاتھوں سے کروایا جاتا ہے، جن اور شیطان کو روپ وبھیس بدلنے اور مادی وجسمانی نقصان پہنچانے والے سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں اور غیر مسلم میں صرف ناموں کا فرق ہے جس طرح ''رام سے بڑا ہے رام کا نام'' مانا اور جپا جاتا ہے، بالکل اسی طرح مسلمان بھی اللہ کو بڑا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور کلام کو بڑا مانتے ہیں۔ مسلمانوں کے نام غلام رسول، عبدالرسول، غلام نبی، عبدالنبی، غلام غوث، غلام خواجہ، غلام جیلانی، غلام دستگیر، غلام محمد، وعبدالعلی ہیں اور رکھے جاتے ہیں۔ گمراہی کی انتہا یہ ہے کہ مترجمین اور مفسرین اپنے ترجموں اور تفسیروں میں روحانی عالم اور روح قبض کرنے کی باتیں لکھے ہیں جبکہ قرآن میں نفس (جان نکال لینے یا اختیار چھین لینے) کا تذکرہ ہے، جس سے انداز لگایا جاسکتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے اعمال ہی نہیں بلکہ عقائد بھی گندے اور گمراہی کے پلندے ہیں جو دراصل آتما پر ماتما اور فاعل حقیقی جیسے عقائد سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہیں۔

دنیا وآخرت کے عذاب سے بچنے کا عملی نمونہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بتادیا ہے، اس کو اختیار کرنے کے لیے سب سے پہلے کتاب وسنت اور اسوۂ صحابہؓ کی روشنی میں اپنے عقائد واعمال کو صحیح ودرست کرنے کی کوشش کی جائے اور یہی دعوت دوسروں کو بھی دی جائے، اس طرح چار (۴) افراد بھی جمع ہوجائیں تو وہ اپنے میں سے ایک شخص کو جو خصوصی طور پر وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (لقمان ۱۵)

''اور صرف اس کی پیروی کرو جو ہر معاملہ میں میری طرف رجوع ہوا کرتا ہے'' کا کاربند ہو، سب مل کر ہر طرح کے دیگر اختلافات کو نظر انداز کر کے اس کو اپنا امیر بنالیں۔ ملحوظ رہے کہ آخر کار وہ بھی ہماری طرح کا ایک انسان ہے، اس سے بھی وقتی طور پر بھول چوک و غلطی کا ہو جانا ممکن اور پھر وہ تائب ہو کر رجوع الی اللہ ہو جاتا ہے تو پھر اس سے اختلاف نہ کریں تا کہ اجتماعیت کو ٹھیس نہ پہنچے، لیکن وہ جان بوجھ کر ارادۃً اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو پھر دوسرے کسی کو سب مل کر امیر منتخب کریں اور اس نظم کو صحیح خطوط پر برقرار رکھنے کے لیے ''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ'' کی سپریم اقتدار والی جماعت قائم کر لی جائے، امیر منتخب کر کے اس کام کو آگے بڑھائیں اور پھیلائیں، اصلاح کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے متعین فرمادیا وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتَابِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ، اِنَّا لَانُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (اعراف) ''اور جو لوگ کتاب کو مضبوط تھام لیتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، بے شک ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے'' اور تبلیغ و اشاعت دین کے لیے وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (انعام ۱۹) ''(اے نبیؐ! آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تا کہ میں اس کے ذریعہ تم کو تمہاری ابدی زندگی کی تباہی سے خبردار کردوں اور جس تک بھی یہ قرآن پہنچے وہ بھی یہی کام کرے'' چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ بھی يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ''ہمارے پیغمبران پر ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور سمجھاتے'' اور امت محمدیہ کو ہدایت فرمائی، وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا، فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان) ''(اے امت محمدیہؐ) اگر ہم چاہیں تو ہر قریہ (گاؤں) میں ابدی عذاب سے خبردار کرنے والا مبعوث کردیں (لیکن اب یہ کام تمہارے ذمہ ہے کیونکہ تم آخری امت ہو) اس کام کو انجام دینے میں ایک تو دنیا والوں کی طرح حصول دنیا کی فکر میں اس طرح مشغول نہ ہو جاؤ کہ اس فرض کی انجام دہی سے تم میں غفلت و لاپرواہی پیدا ہو جائے اور اہل دنیا کے نظریات، عقائد، اعمال کے باطل و غلط ہونے کو قرآنی دلائل سے واضح کرتے رہو'' اللہ کے رسولؐ فرماتے ہیں کہ اللہ نے مجھے **الجماعة، والسمع، والطاعة، والهجرة** کا حکم دیا ہے، یہ جماعت اور اس کا نظم قائم ہو جانے کے بعد جو بھی اس کے خلاف دعوت دے تو اس کا سر اڑا دینے کی ہدایت فرمائی۔

تاریخ گواہ ہے کہ جبر و ظلم کرنے والے دنیا میں باقی نہیں رہے، سابق میں یہ واقعات طویل مدت طے پاتے تھے، لیکن موجودہ دور میں نظریاتی، سیاسی، مذہبی پارٹیوں وغیرہ کے ذریعہ یا اس سے کچھ زیادہ مدت میں ایسے حالات پیدا ہوتے جارہے ہیں جس سے حکومتیں بدلتی چلی جارہی ہیں، مثلاً انگلستان میں چند افراد مل کر ایک سوسائٹی بنائے جس کے ایک رکن برناڈ شاہ بھی تھے اور اس سوسائٹی کے صرف ۵ ہزار ہی ممبر تھے، اس سوسائٹی نے اپنے نظریات و اصول کی تبلیغ و اشاعت کی کوشش کی تو اسی پارٹی کے افراد انتخاب میں منتخب ہو کر حکومت بنائے۔ اس مثال سے غلط فہمی پیدا نہ ہو، اس لیے عرض ہے کہ نوحؑ ۹۵۰ سال تک دن رات قوم کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے پھر بھی چند کے سواء قوم کے افراد ایمان نہیں لائے اور نبی کریمؐ مکہ مکرمہ میں رات دن ۱۳ سال اور صحابہ کرامؓ رسول اللہؐ کے ساتھ مدینہ منورہ میں ۱۰ سال تک اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کی کوشش کرنے کے نتیجہ میں ایمان والوں کی اللہ نے ایک ایسی حکومت قائم کردی اور ان ہی کوششوں کی وجہ سے دنیا کا ہر انسان اسلام سے واقف ہوا ہے، انسانوں کی اصلاح کی کوشش جس طرح ابتداء کی گئی تھی، آج بھی اسی طریقے پر کرنا لازمی و ضروری ہے، ورنہ دنیا کے عذاب ہی سے نہیں بلکہ آخرت کے ابدی عذاب سے بھی بچنا ممکن نہ ہوگا۔

ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی ۔اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبہء اردو، گورنمنٹ ڈگری اینڈ پی۔جی کالج سدی پیٹ

شاعرِ مہر وماہ: مسعود عابد

جدید وعصری لب ولہجہ کے خوش فکر رومانوی شاعر سید علی مسعود عابد اکیلوی ظہیر آبادی مرحوم (1947ء ۔2010ء) کی نعتوں ،غزلوں اور نظموں کا مجموعہ مارچ 2014ء میں جواں سال اسکالر ڈاکٹر نوید عبدالجلیل نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔مسعود عابد نے 1983ء میں اپنا مجموعہ مرتب کر کے ''سورج پگھلے لفظوں میں'' کے نام سے شائع کیا تھا جو ان کی شاعرانہ زندگی کے تقریباً نصف حصہ پر مشتمل ہے ،مذکورہ مجموعہ پورا چاند اور آدھی رات ان کی پچاس سالہ شعری زندگی کا منتخب اور دستیاب شدہ مجموعہ ہے، یہ نام مرتب نے ان کی ایک غزل کی ردیف سے اخذ کیا ہے:

میرے جزبوں کا سرمایہ، پورا چاند اور آدھی رات
ساتھ تیرا سونے پہ سہاگہ پورا چاند اور آدھی رات
چمپا صندل اور رات کی رانی کا جادو کیا کہئے
سامنے ہو جب تہر چہرہ، پورا چاند اور آدھی رات

مذکورہ اشعار کو پوری کتاب کا خلاصہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ان میں جو خوب صورت جھلک پیش کی گئی ہے وہ پوری کتاب کے اوراق میں چمکتی اور نکھرتی نظر آتی ہے، جیسے :جذبوں کی صداقت وحرارت ، مطالعہء کائنات و فطرت ،رومانیت اور حسین ونادر تشبیہات واستعارات وغیرہ۔

مسعود کا کلام فکری وفنی اعتبار سے اہل ادب ونقد کی توجہ اور مطالعہ کا مستحق ہے، انھوں نے لفظی عبو معانوی اعتبار سے فکر وفن کی کسوٹی پر پرکھ کر شاعری کی ہے، اور خالص شاعرانہ انداز اختیار کیا ہے اور عامیانہ انداز سے گریز کیا ہے، فساحت و بلاغت، حسین ونادر تشبیہات واستعارات، نازک خیالی، عربی و فارسی کے فصیح الفاظ کے علاوہ ہندی ودیوناگری کے سبک وملائم الفاظ کے ملاپ سے انھوں نے ایک الگ اسلوب وضع کیا ہے جس میں ترقی پسند شعراء کے رنگ وآہنگ ،موسقیت اور رومانیت پسندی کے ساتھ جدید فکر ومسائل ،جدید الفاظ وتعبیر اور جدید خیالات حسن وخوبی اور پرکاری کے ساتھ شامل کئے گئے ہیں:

کہیں پہ بم ہے کہیں دھما کہ ،کہیں یہ بارود کی سرنگیں
عجب کھلونے ہیں آج کل کے، کہ جن سے انساں بہل رہا ہے
کسی کے گھر کو جلا کے کوئی بسائے ہے قہقہوں کی دنیا
کسی کی دنیا اجڑ رہی ہے ، کسی کا ارماں نکل رہا ہے

مندرجہ ذیل اشعار میں ہندی الفاظ کا استعمال بہت خوبی سے کیا گیا ہے:

شیتل شیتل بوندیں من کی گہرائی میں ٹپکی ہیں
نین میں امرت گھول گیا ہے گوری کا بلور بدن
پورنیما ہے یا امبر پر دودھ کی گاگر ٹوٹ گئی ہے
بھیگ چکا ہے رات کا آنچل دھلا دھلا ہے نیل گگن
ہردے کے سونے آنگن میں کتنی چتائیں جلتی ہیں
رات کا منہ چیرتا ہے جب انگارے برساتا راگ

اور مذکورہ ذیل غزل کے شعر پر دوہے کا شبہ ہوتا ہے:

بندیا، کنگن جھانجھن سب کو آیا ہے یہ دھیان

اپنا بھی ہونے والا ہے پھولوں سا انجام

جب کہ مندرجہ ذیل اشعار میں فارسی و عربی کہ فصیح و بلیغ الفاظ کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے:

درِ قفس سے شمیمِ اسیر نکلتی ہے
شگفتہ غنچوں کو پھر کیوں فتح بات کہوں
شرابِ سرخ سہی ، آتشیں لب وعارض
شرابِ سرخ سے لیکن مرا دہن تو جلے
شرر بن کے لپک ،کوند بجلیوں کی طرح
نگاہِ اہلِ جنوں سے روئے اہر من تو جلے
غزل کے شعر تو کندن کی طرح دمکیں گے
بس ایک پل کے لئے شمعِ فکر وفن تو جلے

مندرجہ ذیل اشعار میں حسین تشبیہات واستعارات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

پسینہ بن کے کبھی ،اشک بن کے ڈھلتا ہے
ندامتوں کی طرح انفعال سا کوئی
کسی ایک کا تبسم ازال افسانے
کھلے ہیں داستاں در داستاں گلاب کے پھول
من کا موم پگھلتا جائے دھیمی دھیمی آہوں سے
رخساروں پہ رنگ ہیں کتنے دہکے ہوئے انگاروں کے

شاعر نے ''ریپکا'' کے مجسمہ کی طرح پتھر سے پھول سا مجسمہ تراشا ہے، نازک پیکر تراشی ملاحظہ ہو:

جسم ہے پھول ،انداز بھی پھولوں جیسا
پھول ہی پھول نظر آتا وہ ترشا پتھر

اور انھوں نے پھول جیسے جسم پر حیا کی شبنمی چادر اڑھائی ہے:

رنگِ دل بدلے اڑتے ہوئے گالوں کا گلال
پھول سے جسم پہ برسے ہے حیا کی شبنم

شاعر کے ذہن پر رومانیت غالب ہے، غزلوں اور نظموں کا بیشتر صفحہ رومانیت کی خوشبوؤں سے معطر ہے، بطورِ خاص یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

پھر ساجن کی یاد دلائیں کالے بادل آنگن میں
اشکوں کی برسات بہائے گہرا کاجل آنگن میں
بیکل من میں آگ لگائے شیتل شیتل پروائی
جب بھی مہکے رات کی رانی، چمپا، صندل آنگن میں

عابد صاحب کی شاعری جذبات واحساسات کی سچی ترجمان ہے، کائنات ،فطرت اور شخص کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ شاعری کی چکّی میں پس کر کبھی شہر کی نفسانفسی بیان کرتے ہیں، تو کبھی گاؤں کی سادگی ،خلوص، بھول پن اور بانک پن پر مر مٹتے ہیں، کبھی ہفت اقلیم سے جنگل میں گیان حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو کبھی زندگی کا تماشہ دکھاتے ہیں، کبھی دنیا کو ٹھوکر مار کر خدا کی ذات سے رشتہ جوڑتے ہیں، تو کبھی خود آگہی کی دعوت دیتے ہیں، اور ان سب پر عابد صاحب کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے:

عابد صاحب سر چڑھ کر خود اس کا جادو بولے گا
دل میں اتر کر جب اس کی پھولوں جیسی یاد

غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی جذبوں کی صداقت ،والہانہ پن، زندگی کے کربناک لمحات ،تنہائی کا زخم ،پاکیزہ رومانیت اور فطرت کا نئے زاویہ سے مطالعہ شامل ہے، ان کے یہاں زیادہ تر آزاد نظمیں ہیں ،البتہ کچھ پابند نظمیں بھی ہیں، فکری وفنی اعتبار سے مندرجہ ذیل نظمیں اپنے رومانوی طرزِ نگارش کی بنا پر غیر معمولی کشش رکھتی ہیں:

جذبوں کی آنچ ،فکرِ صحرا، سوچ کا المیہ، منجمد لمحے، نئی الجھن ،قدر زر راور حسن، کاتبِ تقدیر، لمحوں کی غذا، انتقام، واپسی ،ہجر کا دشت اور اجنبی خواہش۔

ان کی پابند نظموں میں بلا کی شوخی ، بے ساختگی ، جدت اور رومانیت ہے:

بدر کی شکل میں پھر رات کی رانی نکلی
پاؤں میں باندھے ہوئے کاہکشاں کی پائل
رقص کرتی تھی کسی شوخ تبسم کی طرح
دیکھ کر رقص میری یاد نے انگڑائی لی
ذہن تاریک میں تاروں کی طرح کھل اٹھے
رقص کرتی ہوئی راتیں، وہی گاتے ہوئے دن
کھل گئی آنکھ مری ، ہوک سی دل میں اٹھی
ہجر کے دشت میں ہے دور تلک سناٹا
ایک مدت سے رہِ شوق ہے سونی سونی
کوئی آہٹ کوئی پازیب کی جھنکا رنہیں
شب ہے تاریک کوئی شعلہء رخسار نہیں

(ہجر کا دشت)

ان کی آزاد نظمیں زیادہ تر تاثراتی اثر لئے ہوئے ہیں ، ان میں بلا کی دل آویزی اور رعنائی ہے ،تاثراتِ حج ملاحظہ ہوں:

یہ کیسی وادی میں آ گئے ہم
جہاں پہ ساری حقیقتیں بھی
عبادتوں اور عقیدتوں سے جڑی ہوئی ہیں
ہیں ہے سمتوں کا کچھ تعین
شمال ہے نہ جنوب کوئی
نہیں ہے کوئی دشا نہیں ہے
ہر ایک سجدہ
ہے لاکھ سجدہ کا ایک سجدہ
کوئی گدا ہے نہ شاہ کوئی
نہ کوئی نسل و نسب کا جھگڑا
زبانیں رکھ کر بھی لوگ
گونگے بنے ہوئے ہیں
لرزتے ہونٹ اور چھلکتی آنکھوں کے پاک آنسوں
انہی سے دھلی دعائیں
وہی دعائیں شفق میں مل کر
حسین شاموں میں مل گئی ہیں.....
(یہ کونسا دیار ہے؟)

بیٹی کی رخصتی پر ان کی تاثراتی نظم اندرونی کیفیات کی پوری ترجمانی کرتی ہے اور خوشی و غم کے ملے جلے جذبات کی حسین عکاسی کرتی ہے:

مری بچی
دلہن بن کر تو میرے گھر سے جب نکلی
تو مجھ کو یوں لگا
کہ میرا گھر تو جیسے ایک سرائے تھا
گھنا ایک پیڑ تھا
کہ جس کہ سائے میں
چہکتی گنگناتی تھی تو
ملن کے گیت گاتی تھی
مری بلبل
مگر گیتوں میں جذبے تھے
تڑپتے ہجر کے دور کے جذبے
وہ جذبے قرب میں بدلے
کہ تیری آرزوئیں
ہو گئیں پوری
مگر میں جب کبھی محراب میں
یا کھڑکیوں میں دیکھتا ہوں
تری گڑیاں

تری ٹانک کی شیشی، ڈائری
تو لگتا ہے تری یادوں کے سائے
اب بھی مجھ سے بات کرتے ہیں
یہ کہتے ہیں
کہ بیٹی کوئی
ماں باپ کی وہ زندگی ہے
بھلا کیا زندگی بھی ساتھ دیتی ہے ابد تک؟
یقیناً وہ بچھڑ جائے گی
بن کر یاد تڑپائے گی اک دن.....
(یہی تو زندگی ہے)

ان کی دو نظمیں بچوں کے ادب میں شمار کئے جانے کی لائق ہیں: (۱) ماں (۲) املی کا ذائقہ بچپن۔

پہلی نظم میں ماں کی عظمت بیان کی گئی ہے اور اس کی بے لوث محبت، ایثار اور محنت کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے، دوسری نظم میں بچپن کی حسین یادوں اور ماصوم ہرکتوں میں بڑے دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

مسعود صاحب نے عابد تخلص اختیار کر کے اپنے عبادت گزار ہونے کا اقرار کیا ہے، وجیہ، باریش چہرہ، سر پر ٹوپی یا پگڑی دیکھ کر سلسلہء مشائخ کا گماں ہوتا تھا، وضع داری، والہانہ پن، خلوص بے پایاں، دوستوں اور عزیزوں سے حد درجہ محبت و لگاؤ ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں، ان کی شخصیت کا عکس کہیں کہیں ان کے اشعار میں جھلک جاتا ہے:

خزاں کے موسم کے زرد پتے گزرتے لمحوں کے ترجماں ہیں
بکھرتے اوراق کی کہانی میرا وجود آج کل رہا ہے

وہ تازگی سی کوئی چیز بانٹتا عابد
سنا ہے یہ کہ وہ ہے خوش خصال سا کوئی

محمد قلی قطب شاہ کی طرز پر مناجات، نعتیں، اور سفر حج کے تاثرات ان کی مذاہب سے وابستگی کے مظاہر ہیں۔

میری خواہش تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کا بکھرا ہوا کلام یکجا ہو جائے، میں نے نوید عبدالجلیل کو توجہ بھی دلائی تھی، مجموعہ شائع ہونے پر مجھے دلی مسرت ہوئی، میں مرتب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے پھر ایک بار مسعود عابد کی خوابدہ بادوں کو جگانے اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔

ڈاکٹر مسعود جعفری۔ حیدرآباد

نعت شریف

درودوں کو لے کر چلا ہوں مدینہ
کنارے لگادو یہ ٹوٹا سفینہ
عمامہ کو رکھ دوں در مصطفیٰ پر
ملوں اپنے چہرے پہ خاک مدینہ
گریباں تو کیا پیرہن چاک کردوں
پکاریں مجھے لوگ ادنی کمینہ
رسول خدا سے میں مانگوں سفارش
عطا ہو مجھے روشنی کا دفینہ
فرشتے اتر کر کھڑے ہو گئے تھے
ہوا جب بھی ذکر نبی کا شبینہ
مہک تھی گلانوں کی باتوں میں ان کے
معطر معطر نبی کا پسینہ
مسلسل پڑا تھا سرابوں کے پیچھے
بشر کو ملا زندگی کا قرینہ
لکھو تم بھی مسعود اپنی پلک سے
مدینہ مدینہ مدینہ مدینہ

قسط اول

حکیم وسیم احمد اعظمی۔لکھنؤ

'شبلی خودنوشتوں میں'——ایک مطالعہ

'شبلی خودنوشتوں میں' شبلی شناس ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی اب تک کی تازہ ترین کتاب ہے، جو نومبر ۲۰۱۸ء میں اصیلہ پرنٹرس، دہلی سے طبع ہوئی ہے اور شبلی شناسی کے حوالہ سے یہ ان کی بارہویں کتاب ہے۔اس سے پہلے ان کی کتاب متعلقاتِ شبلی (۲۰۰۸ء)، کتابیاتِ شبلی (۲۰۱۱ء)، شبلی اور جہان شبلی (۲۰۱۲ء)، آثار شبلی (۲۰۱۳ء)، علامہ شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط (۲۰۱۳ء)، مکتوباتِ شبلی (۲۰۱۳ء)، شبلی سخنوروں کی نظر میں (۲۰۱۴ء)، شبلی شناسی کے سو سال (۲۰۱۴ء)، شذراتِ شبلی (۲۰۱۴ء)، مراسلاتِ شبلی (۲۰۱۶ء)، نوادراتِ شبلی (۲۰۱۷ء)، شائع ہوکر علمی دنیا میں پذیرائی حاصل کرچکی ہیں۔شبلیات کے حوالہ سے ان کی ایک کتاب 'اقبال اور دبستانِ شبلی (۲۰۱۵ء) بھی بے حد اہم ہے اور شبلی شناسی کے بہت سے پہلوؤں کو واضح کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے 'یک در گیر محکم گیر' کے مقولہ پر عمل کرتے ہوئے حالیہ دو دہائیوں میں شبلی اور آثار شبلی کو اختصاص کے ساتھ موضوعِ تحقیق بنایا ہے اور اس حوالہ سے وہ فردِ وحید بھی ہیں اور فردِ فرید بھی۔شبلی کے بارے میں ان کی معلومات رطب و یابس سے پاک اور توقیتِ شبلی کا سب سے بڑا حوالہ ہیں۔شبلی کے احوال و آثار اور متعلقات پر اُن کا منصوبہ اتنا جامع اور وسیع ہے کہ 'وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی' ہے بھی بہت زیادہ وسیع۔

جہاتِ شبلی کی تلاش و تحقیق اور اس کی علمی، فکری، تہذیبی اور لسانی توقیت ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی ترجیحات میں ہے، وہ شبلی کے حوالہ سے ایسے موضوعات کی تلاش و تکوین کر لیتے ہیں کہ شبلی کو پڑھنے والا چونک جاتا ہے کہ آخر یہ موضوع اس کے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ اور وہ خود اس نکتہ تک کیوں نہیں پہنچ سکا؟ ان کی اب تک کی تازہ ترین کتاب 'شبلی خودنوشتوں میں' کچھ اسی نوعیت کی کتاب ہے۔انہوں نے شبلی کو ۲۵ خودنوشتوں میں تلاش کیا ہے اور تلاش و تحقیق کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، ——اور شبلی کی شخصیت میں جو تنوع اور کثیر جہتی ہے، اس کے تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ 'شبلی خودنوشتوں میں' کا دوسرا حصہ بھی ان شاء اللہ جلد آئے گا۔

شمس الرحمن فاروقی اس کتاب کے 'پیش لفظ' میں لکھتے ہیں:

''کم ہی ایسے لوگ ہوں گے، جنہوں نے کسی ایک مصنف کی زندگی اور تحریروں کے مطالعے کے لئے اپنی عمر وقف کردی ہو اور ان کے مطالعات کا ثمرہ قابلِ قدر تصنیفات کی صورت میں بھی سامنے آیا ہو۔ اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کے لئے اور شرطوں کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ جس شخص کو اپنا موضوع بنایا گیا ہو، اس کی تحریروں میں اتنا تنوع اور اتنی قوت ہو کہ وہ تازیست مطالعے اور گہرے مطالعے کی متحمل ہوسکیں۔پھر یہ بھی ایک شرط ہے کہ جس شخص نے ایسے کام کا بیڑا اُٹھایا ہو، وہ خود صلاحیت اور لیاقت رکھتا ہو اور اس کے مزاج میں اتنی استقامت بھی ہو کہ ناسازگار حالات میں بھی اس کی لگن کم نہ ہو''——''ہمارے دوست محمد الیاس الاعظمی نے پوری زندگی مطالعۂ شبلی میں گذار دی ہے۔یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اب شبلی اور الیاس الاعظمی لازم ملزوم ہوگئے ہیں''۔

اس کتاب میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا 'دیباچہ' بڑا جامع ہے۔اُنہوں نے جن خودنوشتوں کے حوالہ سے شبلی کی بات آگے بڑھائی ہے، وہ درج ذیل ہیں۔یہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر باضابطہ خودنوشت ہیں اور چند بے ضابطہ خودنوشت، بہرحال خودنوشت تو ہیں ہی:

۱۔اختر اقبال، نواب سلطان جہاں بیگم (۱۹۳۰ء——۱۸۵۸ء)، مطبع مفیدِ عام، آگرہ، ۱۹۱۴ء

۲۔آپ بیتی،میر ولایت حسین(۱۹۴۹ء —۱۸۶۲ء)،مسلم ایجوکیشنل پریس،علی گڑھ،طبع اوّل،۱۹۷۰ء
۳۔یادِ ایام،عبدالرزاق کان پوری(۱۹۴۸ء —۱۸۶۲ء)،آتش فشاں پبلی کیشنز،اردو بازار،لاہور،۱۹۹۳ء
۴۔تذکرۂ طاہر،نواب سید محمد علی حسن خاں(۱۹۳۶ء — ۱۸۶۶ء)،ماہنامہ معارف اعظم گڑھ،جنوری——جون ۱۹۳۷ء
۵۔میری کہانی میری زبانی،سید ہمایوں مرزا(۱۹۳۸ء —۱۸۷۰ء)،شمس المطابع،شاہی روڈ،حیدرآباد دکن،طبع اوّل،۱۹۳۹ء
۶۔مشاہدات و تاثرات،شیخ محمد عبد اللہ پاپا میاں(۱۹۶۵ء —۱۸۷۴ء)،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۱۹۱۵ء
۷۔آپ بیتی،خواجہ حسن نظامی(۱۹۵۵ء—۱۸۷۶ء)،دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی،طبع دوم،۱۹۲۲ء
۸۔میری زندگی،مولانا محمد علی جوہرؔ(۱۸۹۸ء—۱۸۸۳ء)،سندھ ساگر اکادمی،لاہور،جنوری ۱۹۶۲ء
۹۔اعمال نامہ،سر رضا علی(۱۹۴۹ء—۱۸۸۲ء)،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،طبع دوم،۱۹۹۲ء
۱۰۔تذکرہ،مولانا ابو الکلام آزاد(۱۹۵۸ء —۱۸۸۸ء)،ساہتیہ اکادمی،دہلی،طبع دوم،۲۰۱۲ء
۱۱۔آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی،مولانا ابو الکلام آزاد(۱۹۵۸ء —۱۸۸۸ء)،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۰۸ء
۱۲۔میرا افسانہ،ملا واحدی (۱۹۷۶ء —۱۸۸۸ء)،آکسفورڈ یونیورسٹی پریس،کراچی،طبع دوم،۲۰۱۵ء
۱۳۔سر گذشت،مولانا عبد الباری ندوی(۱۹۷۶ء —۱۸۸۹ء)،مشمولہ 'مذہب اور سائنس'،مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام،لکھنؤ،طبع سوم،۱۹۹۱ء
۱۴۔یادِ ایام،مولانا ضیاء الحسن علوی(۱۹۴۵ء —۱۸۹۱ء)،ادارہ انیس اردو،الٰہ آباد،۱۹۵۹ء
۱۵۔آپ بیتی،مولانا عبد الماجد دریا بادی(۱۹۷۷ء — ۱۸۹۲ء)،مکتبہ فردوس،مکارم نگر،لکھنؤ،طبع دوم،۱۹۸۹ء
۱۶۔آشفتہ بیانی میری، رشید احمد صدیقی(۱۹۷۷ء — ۱۸۹۴ء)،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،طبع سوم،۱۹۷۷ء
۱۷۔میں اور میری ادبی صلاحیت، مرزا احسان احمد(۱۹۷۲ء — ۹۶،۱۸۹۵ء)،معارف پریس،اعظم گڑھ،۱۹۷۱ء
۱۸۔خاطرات،ظفر حسن ایبک(۱۹۸۹ء —۱۸۹۵ء)،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۰ء
۱۹۔غبارِ کارواں، مولانا سعید احمد اکبر آبادی(۱۹۸۵ء — ۱۹۰۸ء)،ماہنامہ آج کل نئی دہلی،مارچ،۱۹۷۱ء
۲۰۔کاروانِ زندگی،مولانا سید ابو الحسن علی ندوی(۱۹۹۹ء — ۱۹۱۳ء)،مکتبہ اسلام،گوئن روڈ،لکھنؤ،۱۹۹۹ء—۱۹۸۳ء
۲۱۔نقوشِ زندگی، مولانا مجیب اللہ ندوی(۲۰۰۶ء —۱۹۱۸ء)،مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،اعظم گڑھ،طبع اوّل،۲۰۱۲ء
۲۲۔سرگذشتِ ایام،حافظ نذر احمد(۲۰۱۱ء—۱۹۱۹ء)،مسلم اکادمی لاہور،طبع اوّل،۲۰۱۵ء
۲۳۔دھوپ چھاؤں:،پروفیسر ریاض الرحمٰن (پ:اپریل ۱۹۲۴ء)، حبیب منزل،میرس روڈ،علی گڑھ،۲۰۱۱ء
۲۴۔حکایتِ ہستی،مولانا اعجاز احمد اعظمی(۲۰۱۳ء —۱۹۵۱ء)، مکتبہ ضیاء الکتب،شیخوپور،اعظم گڑھ،۲۰۱۱ء
۲۵۔اہلِ علم کی محسن کتابیں،مولانا عمران احمد خاں(۱۹۵۳ء —۱۸۸۴ء)،معارف پریس،اعظم گڑھ،۱۹۴۶ء

معیاری تحریر کی روایت کے عین مطابق کتاب کے آخر میں 'کتابیات' بھی ہے۔اس عنوان کے تحت ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اُن ۱۰۵ مصادر کی تفصیلات دی ہیں،جن سے انہوں نے اکتسابِ فیض کیا ہے۔آئندہ سطور میں ہر خودنوشت کا علاحدہ علاحدہ حاصلِ مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

'اختر اقبال' نواب سلطان جہاں بیگم [دور حکومت ۱۹۲۶ء—۱۹۰۱ء] کی خودنوشت کا دوسرا حصہ ہے۔اس میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک کے حالات درج ہیں۔اس میں شبلی سے

متعلق تین تحریریں ملتی ہیں جو سیرت النبی کی تدوین، حوالہ کی کتابوں سے متعلق مالی تعاون اور اس کے انگریزی ترجمہ کے اخراجات سے متعلق ہیں۔ان میں نواب سلطان جہاں بیگم کی دانش وری، معارف پروری اور شبلی کے علمی اعتراف کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔شبلی کی وفات[۱۸رنومبر۱۹۱۴ء] کی خبر سن کر نواب سلطان جہاں نے بڑی حسرت ویاس سے کہا تھا:

''فقیر بے نوا تو چل بسا سلطان باقی ہے''۔

'آپ بیتی' میر ولایت حسین[۱۹۴۹ء—۱۸۶۲ء] سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی کو میلاد شریف کا انعقاد اور اس میں سیرت النبی ﷺ کا بیان بہت پسند تھا۔وہ اسی بہانے محمڈن کالج علی گڑھ کے طلباء کی علمی و فکری تربیت کررہے تھے۔یہ آپ بیتی شبلی کی علی گڑھ کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر معتبر حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی علمی توقیت کے لیے یادِ ایام مؤلفہ عبد الرزاق کان پوری(۱۹۴۸ء—۱۸۶۲ء) کسی قدر منفی طرزِ فکر اور منفی اسلوبِ نگارش پر مبنی ہے۔اس میں انہوں نے شبلیؒ سے جس بے تکلفانہ ربط وتعلق کا اظہار کیا ہے، دراصل خارج میں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔شبلی شناس ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالرزاق کان پوری نے یادِ ایام میں شبلی سے اپنی گہری دوستی اور خوب خوب ملاقاتوں، سیر سپاٹوں، خوش گپیوں کا بار بار ذکر کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اُن کے بڑے رازدار تھے، مگر تعجب ہوتا ہے کہ شبلی نے ان کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔مکاتیبِ شبلی کے دونوں مجموعوں میں ان کا نام تک نہیں آیا ہے۔مکتوباتِ شبلی میں بھی ان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔اس کے برعکس اخیر دور میں اُن کے امین زبیری سے گہرے مراسم تھے۔ان کے نام مولوی صاحب نے متعدد خطوط لکھے تھے جو اَب چھپ گئے ہیں۔واقعہ صرف اس قدر ہے کہ وہ علامہ کے کثرت سے ملنے والوں میں تھے۔علامہ شبلی کے ذریعہ وہ پہلے سید محمود پھر سرسید کی بارگاہ تک پہنچے اور پھر اُن کے حوالہ سے بھی ایسے واقعات لکھے ہیں، جن کی کہیں اور سے تصدیق نہیں ہوتی''۔(شبلی نوشتوں میں، ص ۴۷)

'یادِ ایام' میں شبلی کے بارے میں مولوی عبدالرزاق کان پوری کی تحریروں میں بس کہیں کہیں ہی حقیقت بیانی ہے، ورنہ زیادہ تر مقامات پر اُن کی خدمات کے بارے میں 'اگر' 'مگر' والا انداز ہے۔وہ عموماً شبلی کے کسی بھی کام کو اوّلیت اور فوقیت دینے سے محترز نظر آتے ہیں اور اِس مرحلہ میں وہ شہباز سے ممولوں کو لڑاتے کی بھی کوششیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔کہیں 'الفاروق' جیسی کتاب مولانا فاروق چریا کوٹی کے گھر کی کنیزوں سے لکھواتے ہیں تو سبقتِ زمانی کے لیے مولوی سراج الدین کی 'سیرۃ الفاروق' کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔شبلی کے سلسلۂ کلامیہ کے تالیفی محرکات کو ندوہ کے سلسلہ میں علماء کی مخالفت کفر کے فتوے سے جوڑتے ہیں اور اس سے بھی جی نہیں بھرتا تو 'الغزالی' کی تصنیف کے دوران علم کلام کی بکثرت کتابوں کے مطالعے کو جوڑ دیتے ہیں۔یعنی شبلی کا تقدم اور تبحر کسی کام میں اور کسی حال میں اُنہیں تسلیم نہیں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''یہ کس قدر خلافِ واقعہ بات ہے، علم الکلام اور الکلام ۱۹۰۳ء—۱۹۰۴ء میں لکھی گئیں۔اس وقت علامہ شبلی حیدر آباد میں ناظم سررشتۂ علوم وفنون تھے اور علماء سے بظاہر اُس وقت کوئی مخالفت بھی نہیں تھی۔چہ جائیکہ کفر کا فتویٰ۔کفر کا فتویٰ تو ۱۹۱۳ء میں ندوہ پر قبضہ کرنے کی غرض سے مولوی عبدالحق کے حواریوں نے لگایا تھا۔''
(شبلی—خودنوشتوں میں، ص ۵۷)

تاریخ سے مولوی عبدالرزاق کان پوری کی آگہی اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ 'موازنۂ انیس ودبیر' کی اشاعت[۱۹۰۷ء] کے وقت مرزا دبیر کو زندہ بتاتے ہیں، جب کہ تاریخ ادب اردو کا ایک مبتدی بھی مرزا دبیر کی تاریخ وفات ۷رمارچ ۱۸۷۵ء بتائے گا۔مولوی عبدالرزاق کان پوری کو شبلیؒ کی شعر العجم بہت پسند تھی، لیکن وہ اس کی اساس ایڈورڈ جی براؤن کی کتاب 'ادبیاتِ ایران' اور خواجہ الطاف حسین حالی(وفات ۱۹۱۴ء) کی 'حیاتِ سعدی' کو قرار دیتے ہیں، اور اس کے طرزِ استدلال کو محمد حسین آزاد (وفات ۱۹۳۰ء) کی تقلید بتاتے ہیں۔فارسی شاعری کے تجزیاتی انداز کو قیروانی کی کتاب العمدہ سے مستفاد گردانتے ہیں۔عبدالرزاق کان پوری کے اس اندازِ فکر سے اور طرز استدلال سے جز بز ہوکر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''——یعنی مولانا شبلی کا کچھ نہیں''۔ (شبلی—خود نوشتوں میں، ص ۵۷)

مولوی عبدالرزاق کان پوری کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''اُنہوں نے ابتداءً شبلی سے اس قدر استفادہ کیا کہ وہ اس کا برملا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ شبلی کی وفات کے بعد جب اُنہوں نے شبلی پر قلم اُٹھایا تو اُن کے ہر کام اور ہر بات میں اُن کی تضحیک کے پہلو نکالے ہیں اور اِس طرح کہ تضحیک بھی ہو جائے اور اُن پر الزام بھی نہ آئے۔'' (شبلی—خودنوشتوں میں، ص ۴۸)

مولوی عبدالرزاق کان پوری نے اس کتاب میں شبلی کے بارے میں انتہائی ناروا زبان بھی استعمال کی ہے، جس کو سید سلیمان ندوی 'شوخیانہ زبان' قرار دیتے ہوئے ناخوشی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اُنہوں نے 'یادِ ایام' کا مسودہ پڑھنے کے بعد مولوی عبدالرزاق کان پوری کو جو خط لکھا ہے اور جسے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنی اِس کتاب میں نقل کیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ سید صاحب نے بھی شبلی کے حوالہ سے اُڑائی جانے والی بعض باتوں پر شعوری یا غیر شعوری طور پر کان دھرا ہے اور آخرِ عمر میں ایک مقدس کام کرنے کی دُہائی دے کر ان سارے واقعات پر گویا خاک ڈالے جانے کی بات کہی ہے اور مولوی عبدالرزاق کان پوری کو اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

''گناہ کا ستر چاہئے نہ کہ تشہیر، اس لئے از راہِ عنایت، بلکہ اس دوستی کے واسطہ سے، جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی، یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالئے تا کہ ان کا نیک نام ضائع نہ ہو اور یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمانوں کے لئے زیبا نہیں''۔

حیرت ہوتی ہے کہ شبلیؒ کے سب سے بڑے چہیتے شاگرد بھی اغیار کے بار بار بولے گئے جھوٹ کو سچ سمجھ بیٹھے اور 'گناہ کے ستر' کی بات کرنے لگے۔ بڑوں نے سچ کہا گیا ہے کہ بار بار، شدت اور تسلسل کے ساتھ بولا گیا جھوٹ اپنے سننے والے کو 'سچ' کا احساس کرانے لگتا ہے۔ شبلی کے حوالہ سے سید سلیمان ندوی کا یہ بیان اسی نوعیت کا ہے۔ ہمیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ سید صاحب نے حیاتِ شبلی میں بہت سے معاملات میں شبلی کا بھرپور دفاع کیا ہے، لیکن یہاں وہ بھی مولوی عبدالرزاق کان پوری کے 'تارِ عنکبوت' میں پھنس گئے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے تحقیقی اور تجزیاتی مقالہ 'شبلی وعطیہ: چند حقائق' مطبوعہ ماہنامہ ایوان اردو، دہلی جون ۲۰۱۹ء کے ذریعہ گرد آلود ذہنوں کی تطہیر کر دی ہے اور سچ یہ ہے کہ اس حوالہ سے یہ اب تک کی سب سے معتبر اور متوازن تحریر ہے۔

سید سلیمان ندوی نے شبلیؒ سے مولوی عبدالرزاق کان پوری کی ملاقاتوں کو 'دوستی' کا عنوان دے دیا ہے، لیکن دوستی تو برابر والوں میں ہوتی ہے۔ مولوی عبدالرزاق کان پوری تو شبلیؒ سے کسی طور بھی لگا نہیں کھاتے تھے، تو پھر دوستی والی بات کہاں سے آ گئی اور کیوں کر آ گئی؟ —اور بفرضِ محال اگر سید سلیمان ندوی کی بات مان بھی لی جائے تو 'یادِ ایام' میں شبلی کے بارے میں مولوی عبدالرزاق کان پوری کو پڑھ کر یہی کہا جا سکتا ہے: ع ——'ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو'

حیرت ہوتی ہے کہ مولوی عبدالرزاق کان پوری کو لکھا ہوا سید سلیمان ندوی کا یہ مکتوب پتہ نہیں کس طرح شورش کاشمیری کے ہاتھ لگا اور وہ 'ابوالکلام' میں نقل کر دیا گیا اور ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی اِس کتاب کا حصہ بھی بنا،—سچ یہ ہے کہ شبلی کے زمانے میں کوئی اُن کا ہمسر نہ تھا، علم و فضل، فکر و تدبر، تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدریس میں ان کے قد کا تو کیا، ان کے قد کے آس پاس بھی کوئی نہ تھا اور شبلی کی علمی قامت کے بارے میں آج تک کا 'سب سے بڑا سچ' شمس الرحمن فاروقی کے لفظوں میں:

''شبلی کے اپنے زمانے سے لے کر آج تک شبلی کا ثانی تو کیا ایسا بھی کوئی نہ ہوا جسے شبلی کا ظِل کہہ سکیں''۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی تحریر کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالرزاق کان پوری کی 'یادِ ایام' کے بیانیہ میں تصنیفی، تالیفی اخلاقیات کی کمی نظر آتی ہے۔ وہ جس طرح سر سید احمد خاں (وفات: ۱۸۹۸ء) اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی (وفات: ۱۹۰۹ء) سے ایسی ایسی باتیں منسوب کر دیتے ہیں، جس پر یقین کرنا

مشکل ہوجاتا ہے۔مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کا یہ مزاج نہیں ہے کہ الفاروق جیسی کتاب اپنے گھر کی کنیزوں سے لکھوانے کی بات کہیں یا خود اُن کی 'البرامکہ' کا شبلی کی طرف انتساب دیکھ کر سرسید احمد خاں خود کو اس انتساب کا اصل حق دار گردانیں۔

اگر معاصرین شبلی کی تحلیل نفسی کی جائے تو واضح ہوگا کہ شبلی کے بیشتر معاصر اُن کے سامنے کوتاہ قامت تھے۔اسی لیے جب علم، تحقیق اور فکر میں کوئی ہمسری نہ کرسکا تو غیر مرئی روحانیت کا شوشہ چھوڑا گیا اور اس کو ایک ایسے حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا کہ جس کا تدارک ذرا مشکل سے ہو۔چوں کہ اس میں معاملہ دلوں کا ہوتا ہے، —اور دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے یا بزعمِ خود روحانیت سے سرشار اس کے چند خاص بندے اور اُن بندوں سے زیادہ اُن کے ہم زاد۔اسی لیے تو 'تصوف' پر شبلی کی تقریر سماعت فرمانے کے بعد دبستانِ روحانیت کی سیادت کرنے والے ایک فردِ فرید یوں گویا ہوئے!

''اگر تصوف قالی چیز ہوتی تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلیتا''۔

گویا اُن پر شبلی کا 'حال' — 'اندرون' سب منکشف تھا۔اسی لیے اُن کو شبلی کا 'قال' متاثر نہ کرسکا تھا۔اصول کے مطابق فیصلہ ظاہر پر ہوتا ہے ،لیکن روحانیت کے یہ پیشوا فیصلہ 'باطن' پر بھی کرتے ہیں، کیوں کہ وہ تو بزعم خود 'باطن آگاہ' بھی ہوا کرتے ہیں۔واقعی ان روحانیت زدہ لوگوں کے بطونِ دماغ میں کیا کچھ پرورش پارہا ہوتا ہے؟ اس کو سمجھ پانا اسی پائے کی روحانیت سے 'سرفراز' لوگوں کے ہی بس کا ہے کہ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔

میں نے اپنی تالیف 'بیت الحکمت کی طبّی خدمات (اشاعت اوّل ۱۹۸۸ء) میں مولوی عبدالرزاق کان پوری کی 'البرامکہ' سے بھرپور استفادہ کیا تھا اور اس میں مجھے شبلی کے تاثر کا احساس بھی ہوتا تھا۔خوش قسمتی سے اُن کی ایک اور تالیف 'نظام الملک طوسی' بھی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی،لیکن وہ مجھے بالکل متاثر نہ کرسکی تھی۔ایک ہی شخص کی تالیفات میں معیار کی اس قدر ناہمواری سے میں بے حد متحیر تھا۔وجہ یہ رہی کہ میں نے 'البرامکہ' کے شبلی سے انتساب کو روایتی 'انتساب' تصور کرلیا تھا،،لیکن ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی اِس کتاب سے واضح ہوا کہ شبلی نے مولوی عبد الرزاق کان پوری کی 'البرامکہ' کی تصحیح بھی کی تھی،اس کے برعکس 'نظام الملک طوسی' کو شبلی کی تصحیح کا شرف حاصل نہیں ہوا،جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر تحقیق سے زبان تک میں کئی طرح کی ناہمواریاں راہ پاگئیں اور وہ البرامکہ جیسا اعتبار نہ حاصل کرسکی۔یہ بات دیگر ہے کہ مولوی عبدالرزاق کان پوری نے حسبِ عادت اس کا بھی ٹھیکرا شبلی کے سر پھوڑنے میں ذرا تردد نہ کیا۔سچ یہ ہے کہ مولوی کان پوری شدید احساسِ کمتری کا شکار تھے،خود تو شبلی کو کچھ کہہ نہیں سکتے تھے،اسی لیے ساری زندگی مولوں کو شہباز سے لڑاتے رہے۔دراصل اُن کے 'زندوں سے ڈرنے اور مردوں پر شیر' ہونے کا یہ عمل خود اُنہی کو کوتاہ قد بتاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

'' یادِ ایام آپ بیتی کے طور پر لکھی گئی ہے اور شبلی کا تذکرہ دوست بن کر لکھا گیا ہے مگر جس قدر خرافات اس کتاب میں بیان ہوئے ،وہ امین زبیری کی کتاب سے کم نہیں۔غالباً یہی وجہ تھی کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی اشاعت سے انکار کردیا تھا''

(یادِ ایام،بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں ص ۶۱)

نواب سید محمد علی حسن خاں[۱۹۳۶ء—۱۸۶۶ء] اخلاق کریمانہ کا اعلیٰ معیار پیش کرنے والے دانشور تھے۔وہ شبلی کے قدر دانوں میں تھے،اُنہوں نے 'تذکرۂ طاہر' میں شبلی کے علمی آثار کا معاصر ادب اور مابعدِ شبلی کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی علمی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا ہے،لکھتے ہیں:

''علامہ ممدوح کی تالیف وتصنیف نے اربابِ قلم کے لیے ایک نئے باب کا اضافہ کردیا اور اہل ہند میں تاریخی مذاق پیدا کرکے گویا ایک صلائے عام دے دی۔اس لئے چند دنوں میں ہی سوانح عمریاں جمع وترتیب ہوکر مشتہر ہوگئیں اور تھوڑے عرصہ میں ایک عظیم الشان ذخیرہ تاریخی واقعات اور اسلاف کے حالات کا فراہم ہوگیا''

(تذکرۂ طاہر بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں،ص ۶۶)

شبلی کی 'المامون' کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بھوپال میں خاص کر اس کتاب نے عام ذوق تاریخ اسلام کے

مطالعہ کا پیدا کر دیا اور جو مخالفت تحریک علی گڑھ اور سرسید سے عام طور پر برپا تھی، اس کا آہستہ آہستہ ازالہ صرف سلسلۂ تصانیفِ علامہ شبلی و دیگر اسلامی کتب کی اشاعت و عام مطالعہ سے ہوتا گیا۔''
(تذکرۂ طاہر بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص۔۶۷۔۶۶)

شبلی سے ان کی شیفتگی اور اس حوالہ سے ان کی بے باکی بے مثل تھی۔ وہ شبلی کے لیے مصلح حکیم، مرشد خبیر اور قتیل ندوہ کے جیسے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے، یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اب میں اس تذکرہ کو اس مصلح حکیم اور مرشد خبیر کے ذکر و دعا پر ختم کرتا ہوں، جس کو ندوہ کے ساتھ روح و جسد کا سا تعلق رہا ہے، جس نے اپنی زندگی کی بہترین فرصتوں اور قوتوں کو ندوہ کی راہ میں وقف کر رکھا تھا۔ جس کی فکرِ حکیم اور رائے مستقیم نے قیامِ دارالعلوم اور اصلاحِ نصاب کو اصلاحِ دینی کا اصل و اساس سمجھ کر سب سے پہلے اس عملِ جلیل کی بنیاد ڈالی اور احیائے اُمتِ مرحومہ کی جس حقیقتِ کبریٰ کو باوجود محسوس کرنے کے حکیم الامۃ جمال الدین اسد آبادی اور مفتی محمد عبدہ مرحوم عمل میں نہ لا سکے، اس کو حضرت علامہ شبلی مرحوم نے عملاً نمایاں کر کے دکھایا۔ مگر افسوس کہ بایں ہمہ بد بختانہ طور پر ندوۃ العلما اس کے فیض بخشیٔ حیات سے محروم رہا اور اس قتیل ندوہ اور فدائے اصلاحِ دینی کے خدماتِ عظیمہ سے مستفید نہ ہو سکا۔'' (تذکرۂ طاہر بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص۷۰)

'میری کہانی میری زبانی' سید ہمایوں مرزا [۱۹۳۸ء —۱۸۷۰ء] سے بھی حیات و خدماتِ شبلی کے بارے میں چند ایسی اطلاعات ملتی ہیں جو صرف سید ہمایوں مرزا کی اس کتاب میں مندرج ہیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اس کتاب کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور شبلی کے حوالہ سے بعض اوّلیات کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کتاب کے علمی تسامحات کی بھی نشان دہی کی ہے، جو اُن کو شبلی شناس قرار دینے والوں کی تائید و توثیق کرتی ہے۔ بہر حال 'میری کہانی میری زبانی' سے شبلی کے قیام حیدرآباد کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

شاگردِ شبلی شیخ محمد عبداللہ پاپامیاں [۱۹۶۵ء — ۱۸۷۴ء] کی کتاب 'مشاہدات و تأثرات' جو ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے لفظوں میں 'آپ بیتی کم، جگ بیتی زیادہ ہے'۔ میں شبلی کی عظمت کا بھر پور اعتراف ملتا ہے، اس میں شبلی کے حوالہ سے گردش کر رہی بہت سی باتوں کی علیٰ رؤس الاشہاد نفی کی گئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ شبلیؒ سلطان ترکی کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے اور سرسیدؒ خلافت کو سخت ناپسند کرتے تھے، دونوں دانشوروں کی فکر میں اختلاف تھا، لیکن باہم بے حد احترام و لحاظ تھا۔ حیاتِ شبلی میں کے بعض اندراجات سے شیخ محمد عبد اللہ پاپامیاں کو اختلاف تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم بھی سرسید کی (سیاسی) رائے سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن اپنی زندگی میں سرسید کی صداقت پر حملہ نہیں کیا، لیکن ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب 'حیاتِ شبلی' میں سرسید کے مذہبی اور پولیٹکل اور دیگر خیالات پر بہت کچھ نکتہ چینیاں کی ہیں۔ میں ذاتی واقفیت سے مولوی صاحب موصوف کی نکتہ چینیوں کی تصدیق نہیں کر سکتا، بلکہ ان نکتہ چینیوں کو مولوی صاحب کی ناواقفیت پر محمول کرتا ہوں''۔ [مشاہدات و تاثرات بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص۸۶]

خواجہ حسن نظامی [۱۹۵۵ء — ۱۸۷۶ء] کی 'آپ بیتی' میں بھی 'ذکرِ شبلی' ہے۔ خواجہ حسن نظامی اور شبلی میں برابری کے مراسم تھے اور ۱۹۰۹ء میں دہلی میں ایک مہینہ تک شبلی ان کے مہمان رہے تھے۔ ان میں خوب مراسلت بھی رہی ہے۔ جو اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۱۳ء پر بسیط ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کے بیس خطوط کو 'تالیق خطوط نویسی' میں شامل بھی کیا ہے۔ ان خطوط سے ان کے بے تکلفانہ مراسم کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ خواجہ صاحب کی اس آپ بیتی سے اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کی بڑی وجہ ہے کہ شبلی کے بیشتر معاصر اپنے جملہ تحفظات کے ساتھ اُن سے ملتے تھے۔ اُن کے تحت الشعور میں شبلی کی عبقریت تھی، جو خود تحفظی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کرتی تھی اور شبلی تھے کہ کھلے ذہن و دماغ سے ملتے تھے، کہ انہیں کسی تحفظ کی ضرورت نہیں تھی۔ تصوف پر شبلی کی تقریر سن کر خواجہ حسن نظامی کا یہ کہنا کہ ''اگر تصوف قالی چیز ہوتی تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا''، یہ خود تحفظی حربہ نہیں تو اور کیا ہے۔ شبلی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ نظامی صاحب کے کنویں میں ڈول ڈالتے۔ وہ نہ تو اس مزاج کے تھے اور نہ ہی اس ماحول کے اور نہ ہی اس فکر کے۔

محمد قاسم۔ٹولی چوکی۔حیدرآباد

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا تفسیری امتیاز

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسنِ انشاء وبیان کے جو پھول کھلائے ہیں یوں تو وہ سبھی سدا بہار ہیں؛ لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

اجتہادِ فکر، وسعت نظر، ادبی ہیئت، مطالعہ اور جذبۂ تحقیق وتدقیق مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کے تمام علمی اور ادبی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ مولانا کی یہ ساری خصوصیات ان کی تصنیف ''ترجمان القرآن'' میں بھی جابجا نمایاں ہیں، اسی بنا پر اردو تفاسیر و ادب کے علمی ذخائر میں اس تفسیر کو بھی ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں سینکڑوں تفاسیر لکھی جا چکی ہیں جو اپنے آپ میں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں، سبھی مفسرین کی تفسیر میں اپنا عام رنگ ہے۔ اکثر مفسرین ایک آیت کی تشریح وتوضیح میں یا اس سے مستخرج احکام میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان اقوال سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں جو ہر مفسر کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارباب علم ودانش ان سے استفادہ تو کر لیں لیکن عام اذہان اپنی کم علمی کی بنا پر الجھ کر رہ جاتے ہیں، نتیجتاً قرآن کا مقصدِ اصلی یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشیں کر کے اس کا یقین پیدا کرنا وہ مفقود ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ علم الکلام یا علم الفقہ کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیت سے ثابت کر یا اور دوسرے مسالک کی تردید کے لئے استدلال کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل وتوجیہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ کلام اللہ کی عمومیت، اس کا خطاب، اس کی جامعیت اور اس کے بے قید وبند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور قرآن فقہی وکلامی بحث کا میدان بن جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے اس عام روش کیخلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عمومیت کیساتھ ہم آہنگ ہے۔

''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد سورہ فاتحہ تا سورہ انعام ۱۳۹۱ھ اور دوسری جلد سورہ اعراف تا سورہ مومنون ۱۳۹۱ھ میں شائع ہوئی، سیاسی اور وزارتی مصروفیات کے باوجود مولانا اس مہم میں لگے رہے، تیسری جلد بھی مولانا نے شروع کر دی تھی لیکن مولانا کے ۱۹۸۵ء میں خیر باد کہنے کی وجہ سے وہ کام ادھورا ہی رہ گیا مولانا کی وفات کے بعد ''ترجمان القرآن'' کو دو جلدوں کے بجائے ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۸۶ء میں تین جلدوں میں اور پھر ۱۹۹۶ء میں چار جلدوں میں شائع کیا۔

''ترجمان القرآن'' کی یہ چار جلدیں جو کہ صرف اٹھارہ پاروں پر مشتمل ہیں اپنے اندر دینی، علمی اور ادبی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا آزاد اس کی غرض وغایت کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک ایسی کتاب اردو میں تیار ہو جائے کہ اس کا پڑھ لینا اور پڑھا دینا، قرآن کے مقاصد ومطالب کے سمجھ لینے

اور اسے حقیقی شکل ونوعیت میں دیکھ لینے کے لئے کافی ہو۔ وہ نہ اس قدر ضخیم ہو کہ ہر شخص اس کے مطالعہ کے لئے وقت نہ نکال سکے اور نہ اس قدر مختصر ہو کہ مطالب کی وضاحت تشنہ رہ جائے، اس کی نوعیت ترجمہ کی ہو لیکن ایسا ترجمہ جو اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نا ہو۔''

مولانا آزاد نے کسی دوسری کتاب کی تصنیف پر اتنا وقت صرف نہیں کیا۔ کم وبیش ۵۵ سال کا ثمر ''ترجمان القرآن'' ہے۔ مولانا خود اس بات پر راقم ہیں کہ:

''میری زندگی کا سارا ماتم یہی ہے کہ میں اس عہد اور اس عمل کا آدمی نہ تھا مگر اسکے حوالے کر دیا گیا۔''

یہاں مولانا آزاد اپنی دل شکنی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۱۹۸۱ء تک قرآن کا ترجمہ مکمل کر چکے تھے لیکن بار باران کی گرفتاریوں اور تلاشیوں کے سبب ترجمہ کے مسوودات اور کتابت کئے ہوئے اوراق کو برباد کر دیا گیا تھا لیکن مولانا آزاد کی انتھک محنت وجستجو کے بعد ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی جس پر مذہبی حلقوں اور کچھ علمی حلقوں میں ملا جلا ردِ عمل رہا۔ مولانا کے ترجمان القرآن کے خریدنے کے لئے سید سلیمان ندوی نے اُن کی شیروانی کے بٹن فروخت کئے اور ''ترجمان القرآن'' کو حاصل کیا۔

ترجمان القرآن میں سورہ فاتحہ کی تفسیر وتوضیحات کا سرسری جائزہ مولانا کی دینی معلومات، علومِ متعلقہ پر گہری نظر اور جدید وقدیم ذخائر کتب کے مطالعہ کی گواہی دیتا ہے۔ ساتھ ہی علومِ دینیہ کی تحقیق اور چھان بین کے سلسلہ میں مولانا کی تنقیدی بیدار مغزی کی غمازی کرتا ہے، مولانا کے نزدیک یہ سورت جو صرف سات آیات پر مشتمل ہے پورے ''قرآن مجید'' کی مجمل تفسیر ہے اور اس سورت میں اِجمالاً وہ مقاصد بیان کر دئے گئے ہیں جو ''قرآن مجید'' کی تمام صورتوں میں تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں۔ مولانا کی اس صورت کی تشریح کی اہمیت کا اندازہ سید سلیمان ندوی کی اس عبارت سے لگایا جاسکتا ہے:

''اِس میں سورہ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دلنشین تشریح اور بصیرت افروز تفسیر ہے کہ اس سے ''سورہ فاتحہ'' کے اُم الکتاب ہونے کا مسئلہ مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے اور اسلام کے تمام مہمات، مسائل اور اصولِ دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے۔''

سورہ فاتحہ کی تعلیمی روح پر غور کیا جائے تو ہمیں اس کا ماحصل سات آیتوں پر نظر آتا ہے، جن میں انسان کو خدا کی حمد وثنا سکھانے کے بعد اس کے ذہن میں رب العالمین کی پروردگاری رحمت اور عدالت کا تصور پیدا کرتی ہے پھر انسان عبادت واستعانت کو صرف ایک ذات سے وابستہ کر کے گمراہی کی راہ سے ہٹ کر سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق مانگتا ہے۔

مولانا نے ترجمہ وتفسیر میں منہج سلف سے دور افتادہ متقدمین ومتاخرین کی تفاسیر کی اتباع سے گریز کیا، انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں اپنی خداداد صلاحیت وبصیرت اور فطری عقل وفہم کی روشنی میں اُسی تفکر وتدبر کی راہ پر چلے جس کی قرآن نے دعوت دی ہے۔ یہ بات اور ہے کہ نظری وفکری کاوشوں میں صواب وخطا کے احتمال وامکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا کے نزدیک قرآن مجید کے طریقِ استدلال کا اولین مبدا تعقل وفکر کی دعوت ہے اور وہ جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لئے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل وبصیرت سے کام لیا اور اپنے وجود کے اندر باہر جو کچھ بھی محسوس کرے اس میں تاثر اور تفکر کرے۔ ترجمان القرآن میں تفسیری حواشی جابجا اس طرح بکھرے ہیں جو مولانا کی دینی فہم، حکیمانہ استدراک اور علومِ جدیدہ کی تحقیقات سے باخبر ہونے کی شہادت دیتے ہیں، مولانا نے سائنس کے نت نئے

انکشافات اور دیگر علوم وفنون سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور دین کی فطری بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے موجودہ عہد کے انسانوں کی تشفی کی خاطر تعقل اور تفکر کی گہرائیوں کو چھان مارا ہے۔ مولانا کا عقیدہ تھا کہ قرآنی تعلیمات انسانی علم وعقل کی ترقیوں کے لئے اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہی موجودہ امتیازات کے پیش نظر سید سلیمان ندوی نے ''ترجمان القرآن'' کی امتیازی حیثیت پر اپنا تبصرہ کچھ یوں لکھا ہے:

''مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور اس فتنہ افرنگ کے عہد میں اس طرز وروش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فتنہ تاتار میں پسند کیا تھا اور جس طرح انہوں نے اس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفہ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا، اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی فلسفہ افرنگ ویونان کی ذہنی غلامی کو قرار دیا اور نسخہ علاج وہی تجویز کی عقل وفلسفہ سے سمجھنا چاہئے۔''

''ترجمان القرآن'' پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں تک اخبارات ورسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا، جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اگر تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں صرف ایک نکتہ سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ کہ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفاسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے یعنی قرآن میں جہاں کوئی حقیقت مطلق ہے تو مولانا نے بھی اس کو اسی طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت مقید بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے۔ یقیناً اس اسلوب اور زاویہ نظر سے ان لوگوں کو ضرور اختلاف ہونا چاہئے جو قرآن مجید میں صرف فقہ وکلام کو تلاش کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر مولانا کے بقول یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیگر تفاسیر میں فروعی باتوں پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک قرآن کی اہمیت اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع وتمدن سے ہے ان پر یا تو کلام نہیں کیا جاتا یا کلام کیا بھی تو محض سرسری وضمنی، جس سے قرآن کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے اور اس کا خطاب صرف ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔

''ترجمان القرآن'' کا اسلوب بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے، اس میں وعد بھی ہے اور وعید بھی۔ مولانا آزاد کی اپنی بصیرت نے اس اسلوب کی تخلیق کی ہے، بالخصوص سورہ فاتحہ کا اسلوب جو فکر انگیز اور معنیٰ خیز ہے۔ عبارتیں سادگی سے پر ہیں، موضوع اور ہیئت کی وحدت نے اس اسلوب کو زیادہ موثر اور جاذب نظر بنا دیا ہے۔ مختصر لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی ومعارف کا سرمایہ مولانا کے اسلوب کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ مولانا نے قرآن مجید کے مطالعہ میں اس درجہ انہماک سے کام لیا ہے کہ اُن کے تحریری وتقریری مواد واسلوب دونوں قرآنی اسلوب سے مغلوب ہوگئے اس طرح مولانا کی نثر میں قرآنی لب ولہجہ کی خصوصیت محسوس ہونے لگی۔ سجاد انصاری لکھتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی۔''

مولانا آزاد کی زبان عربی آمیز اور ثقیل تھی۔ جیسا کہ الہلال اور البلاغ کی زبان سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن ''ترجمان القرآن'' کی زبان بڑی سادہ اور سلیس ہے۔ زبان کا یہ فرق اس وجہ سے پایا جاتا ہے کہ الہلال اور البلاغ میں مولانا کا مخاطب صرف تعلیم یافتہ طبقہ تھا۔ اس دور میں تعلیم یافتہ طبقہ کی رابطہ کی زبان عربی اور فارسی آمیز ہوا کرتی تھی؛ لیکن ''ترجمان القرآن'' ایک عام قاری کیلئے تھا جس کے لئے زبان کا سلیس ہونا بیحد ضروری تھا۔ اس کے باوجود............................. (بقیہ ص:۳۴ پر)

شیخ شہباز۔ پی۔ ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، ایس۔ وی یونیورسٹی تروپتی، آندھراپردیش

پیغام آفاقی کے ناول ''دوست'' کا تجزیاتی مطالعہ

پیغام آفاقی یوں تو ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اور ہر صنف ادب میں انھوں نے مساوی توازن کو برقرار رکھا ہے۔ ایک ناول نگار کی حیثیت سے بھی عصرِ حاضر کے اُردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کا طرز امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی بات کو سیدھی سادی سلیس زبان میں بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پیغام قاری تک بہ آسانی پہنچ جاتا ہے۔ یہی انداز انھیں اپنے ہم عصروں سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ وہ ناول نگاری کے ذریعے ہی فکشن کی دنیا میں متعارف ہوئے ہیں۔ ان کی ناولوں کے مطالعہ سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ فہم و اِدراک کی نیرنگی بھی شامل ہے۔ اس تعلق سے ثروت خاں اپنے ایک مضمون میں اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''دراصل اُردو ادب میں پیغام آفاقی ایک ایسا نام ہے جن کے افکار میں گہرائی، گیرائی اور فہم کی قوسِ قزح کی نیرنگیاں اپنی مکمل تہہ داری کے ساتھ قارئین کو اپنے روش پر سوار کر کے ایک ایسی دنیا سے تعارف کرواتی ہے جہاں وہ دنیا کی سفاک سچائیوں کے روبرو ہو کر تخلیق کار کی فکر میں اپنی فکر کو مدغم کر دیتا ہے۔'' (ماہنامہ اُردو دنیا، مئی 2018، پیغام آفاقی کے کتابوں کا انتساب، ص۔36)

پیغام آفاقی کا ناول ''دوست'' ان کے انتقال کے بعد 2018ء میں شائع ہوا جس کو ان کی شریک حیات رفیعہ سلطانہ اور سلمان عبدالصمد نے ترتیب دیتے ہوئے چھپوایا ہے۔ مرتبین نے پیغام آفاقی کی اس تصنیف کو پیغام آفاقی کے قارئین کے نام منسوب کیا ہے۔ ناول ''دوست'' مکمل طور پر معاشرتی ناول ہے جو عصرِ حاضر کی بدلتی تہذیب کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس ناول میں یوں تو نیا موضوع انتخاب نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہی موضوع کی ترسیل کی گئی ہے جو عموماً ہم اپنے معاشرے میں اپنے اطراف روز مرہ زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ مشاہدے سے ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ پیغام آفاقی کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ ان کے دیگر ناول بھی عمیق مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ہی تخلیق ہوئے تھے۔ اس طرح ممکن ہے کہ یہ ناول بھی ان کے کسی تجربے کی دین ہو۔

''دوست'' پیغام آفاقی کا آخری ناول ہے۔ اس میں ناول نگار نے بلا وجہ کرداروں کی بہتات سے گریز کیا ہے۔ کافی کم کردار رکھتے ہوئے کہانی مافی الضمیر کو مناسب انداز میں پیش کیا ہے۔ ''نینا'' اور ''ہاشم'' ناول کے اہم کردار ہیں جو شروع سے آخر تک ہر منظر میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ ''سرین'' (SAIRIN)، کمال، رحمانی، مولوی صاحب اور نو سال کا لڑکا صفات بس یہی کردار ہیں جو کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

اگر اس ناول کے پلاٹ کے متعلق کہا جائے تو اتنا کہا جاسکتا ہے کہ کہانی میں کہیں بھی جھول نہیں ہے۔ سیدھی سادی کہانی ہے جو منالی کی خوبصورت پہاڑیوں میں واقع ایک خوبصورت ہوٹل کے ایک کمرے سے شروع ہوتی ہے۔ ساری کہانی فلیش بیک میں بیان کی گئی ہے۔ یہ کہانی ایک عورت اور ایک مرد کے اِردگرد گھومتی ہے۔ گویا یہ دونوں ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں اور دونوں ایک ہی محور پر گردش کر رہے ہیں۔

''نینا'' جو تقریباً بتیس تینتیس برس کی لڑکی تو نہیں کہہ

سکتے بلکہ ایک پختہ عورت ہے جس نے ایک دنیا دیکھی ہے جب کہ ہاشم چالیس اکتالیس کی عمر کا ایک ایسا شخص ہے جس کی شخصیت کئی پیچیدگیوں میں گھری ہوئی ہے۔ کہانی اس طرح ہے کہ جے۔ این۔ یو کے پروگرام میں ''نینا'' کی ملاقات ہاشم سے ہوتی ہے۔ نینا لکھنو کی رہنے والی ہے۔ وہ مطلقہ ہے اور ایک بچے کی ماں بھی ہے جس کا نو سال کا لڑکا اپنے باپ کمال رحمانی کے پاس رہتا ہے۔ اس کا نام صفات ہے۔ نینا طلاق کے بعد جے۔ این۔ یو میں داخلہ لیتی ہے۔ یہیں نینا کی دوستی سیرین سے ہوتی ہے جو جے۔ این۔ یو میں ہی زیر تعلیم ہے۔ سیرین ہی ایک واحد دوست تھا جو نینا کا ہر حال میں ساتھ دیتا تھا۔ یونیورسٹی سے قبل بہت پہلے سیرین اور نینا کا اسکول میں بھی ساتھ رہا تھا۔ سیرین کو جے۔ این۔ یو میں ہی نینا سے محبت ہو جاتی ہے اور نینا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سیرین بنگلور چلا جاتا ہے لیکن نینا ابھی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی۔ اس لیے ہاسٹل میں رہتی تھی۔

سیرین کے بنگلور چلے جانے کے بعد ہاشم اور نینا کی ملاقاتیں مزید فروغ پاتی ہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے مزید قریب آنے لگتے ہیں۔ اسی اثناء میں کسی ملاقات کے دوران نینا ہاشم کو بتاتی ہے کہ:

''اس (سیرین) کو مجھ سے بہت محبت ہے۔ میں اس سے شادی کرنے والی ہوں۔ اب وہ بنگلور چلا گیا ہے۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں چاہوں تو اس کے پاس بنگلور جا سکتی ہوں۔'' (دوست از پیغام آفاقی، ص۔78)

نینا بھی وعدہ کر چکی تھی کہ وہ بھی سیرین سے شادی کرے گی جب کہ وہ جانتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان کئی ایک دیواریں کھڑی ہیں جو سماج نے اٹھا رکھی ہیں۔ ان دونوں کے مذہب الگ الگ تھے۔ سیرین کنوارہ تھا جب کہ وہ مطلقہ اور ایک بچے کی ماں تھی۔ نینا کی کشمکش کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ہاشم سے جذباتی لگاؤ بھی تھا۔ ایک دفعہ وہ ہاشم سے شادی کا ارادہ ظاہر کرتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

میں آپ (ہاشم) ہی سے شادی کرتی لیکن میں ہر جگہ لیٹ ہو جاتی ہوں۔ میں سیرین سے شادی کرنے کا عہد و پیما کر چکی ہوں اور اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی۔ آپ سے مجھے جذباتی لگاؤ ہو گیا ہے لیکن میں سیرین سے کہہ چکی ہوں اور وہ بھروسہ کرتا ہے۔ نہ جانے اس نے کیا خواب بُن لیے ہوں گے۔ (دوست از پیغام آفاقی، ص۔78)

نینا اپنے اور سیرین سے جڑی ہر بات ہاشم کو بتاتی ہے۔ ہاشم ایک مخلص اور سچے دوست کی حیثیت رکھتا ہے۔ نینا اور سیرین قانونی طور پر کورٹ میریج کر لیتے ہیں۔ چوں کہ سیرین کا خاندان ان دونوں کی شادی کے لیے متفق نہیں تھا۔ شادی کے بعد ہر عورت کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ بچے کی ماں بنے لیکن سیرین سے شادی کے بعد وہ اس کے بچے کی ماں بننا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ وہ اپنے بچوں کو معاشرے کے دو الگ الگ دائروں کے حصار میں بانٹنا نہیں چاہتی تھی جو اس کے خیال میں ایک عذاب سے کم نہیں۔

شادی کے بعد سیرین کی غیر موجودگی میں نینا اور ہاشم کی ملاقاتیں مزید بڑھنے لگیں۔ دونوں ایک دوسرے کے اور قریب آنے لگے تو سیرین نے کہا تھا ''You will not meet him any more''۔ ایک روایتی شوہر کی طرح وہ اسے ہاشم سے نہ ملنے کا حکم سنا رہا تھا۔ پہلی بار سیرین نینا کو ہزاروں سال پرانے پنچایت سسٹم کا ایک غیر مہذب بے رحم شوہر لگ رہا تھا۔ وہ سیرین سے آخری بار کہتی ہے:

Sarin I think I have again committed a mistake

(دوست از پیغام آفاقی، ص۔7)

آخر کار نینا ہاشم کے گھر پہنچ کر بحیثیت دوست، بیوی رہنے لگی لیکن ناول میں کسی بھی طرح سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ وہ دونوں قانونی طور پر باضابطہ شریعت اسلامی کی روح سے نکاح کیا تھا لیکن وثوق کے ساتھ یہ گمان ہوتا ہے کہ ان دونوں کے لیے دوستی کا رشتہ ہی کافی اہم تھا جس میں وہ پورے اخلاص کے ساتھ ایک مرد اور عورت کے فطری تقاضوں کو بھی بلا جھجک سرانجام دیتے ہیں۔

پیغام آفاقی ایک ایسے لکھاری (Writer) ہیں جو اپنی کسی بھی تخلیق کی اشاعت میں عجلت پسندی کو روا نہیں رکھتے بلکہ اپنی تخلیق کو پائیدار بنانے اور اغلاط سے بری پیچیدگیوں سے اور بے ربطیوں سے دور رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

دوست ایک ایسا ناول ہے جس میں ملک و معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے ان واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے جو عورت کے ظلم و استبداد سے متعلق ہے۔ دراصل یہ ناول عورت کے مسائل و مصائب اور اس کی پیچیدگیوں سے جڑے معاشرے کی زبوں حالی کا المیہ ہے۔ نینا اس ناول میں کئی طرح کے روپ میں نظر آتی ہے۔ وہ ایک بیٹی ہے، ماں ہے، بیوی ہے، محبوبہ ہے اور کسی کی دوست بھی ہے۔ باوجود اس کے اسے فطری سکون اور فطری آسودگی میسر نہیں ہے۔

نینا کا سسرال بھی بالکل ویسا ہی تھا جو عموماً آج کے معاشرے میں دکھائی دیتا ہے جس کی قیمت لڑکی والے چکاتے ہیں۔ وہی لالچ، وہی طلب، پھر بھی پیاس بجھنے کا نام نہیں۔ کمال رحمانی بھی نینا کے جسم کی نشہ آور تازگی کو چوسنے کے بعد اس کو ایک گھسی پٹی بچہ پیدا کرنے والی کے سوا کچھ اور اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح والہانہ محبت تو دور ڈھنگ سے بات بھی کرنا گوارہ نہیں سمجھ رہتا تھا۔

پیغام آفاقی اپنے اس ناول میں مرد کی جبلّت کے ایسے روپ کو پیش کیا ہے جس میں شوہر اپنی بیوی کا استحصال یہ مان کر کرتا ہے کہ دیگر کاموں کی طرح سیکس (Sex) بھی ایک روٹین عمل ہے۔ بھلے ہی اس میں بیوی کی مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔ اس طرح انھوں نے محبت اور ہوس کے فرق کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''جب انھوں نے مجھے گندی گالیاں دیں تو ایک لمحے میں گویا میری دنیا بدل گئی۔ اس کے بعد یہ معاملہ ہو گیا کہ مجھے دو منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ میری پٹائی شروع کر دیتے۔ ایک دن تو میرے چھوٹے بھائی اور بہن کے سامنے میرے کپڑے پھاڑ دیئے۔ میرا برا تک پھاڑ دیا۔ اگر کوئی عورت ہوتی تو سمجھیے۔'' (دوست از پیغام آفاقی، ص۔40)

ناول ''دوست'' کے مطالعے سے ایک ایسی نئی تہذیب کی جھلک واضح ہوتی ہے جس میں مکمل طور پر مسلمہ رشتہ ازدواج سے فرار کی کیفیت موجود ہے۔ نہ صرف فراریت کی کیفیت مرد کی ذہنیت میں ہے بلکہ اس ناول کا نسوانی مرکزی کردار بھی اس فراریت پر گامزن ہے۔ اس طرح اس ناول سے معاشرتی و مذہبی اقدار پر کاری ضرب لگتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مجموعی طور سے کہا جائے تو ''دوست'' کا موضوع نیا اور اچھوتا ہونے کے ساتھ ساتھ Challenging بھی ہے۔ چوں کہ یہ سماج اور معاشرے میں ایک ایسے نظریئے کو لے کر آیا ہے جسے قبولیت حاصل ہونا سہل نہیں ہے۔ چوں کہ ناول کا حسن محض خالص جمالیاتی تجزیہ نہیں ہوتا بلکہ انسانی اقدار کا محاسبہ اور اخلاقیات کا مراقبہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ نسوانی کرداروں کی پیش کشی کے اعتبار سے اس ناول کو ایک منفرد ناول کہا جا سکتا ہے۔ پیغام آفاقی کے ناولوں کے مطالعہ سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تانیثی اقدار کا تصور سابقہ ناول نگاروں سے بالکل مختلف ہے۔

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اقبال فہمی

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

مفردات: گیسو: زلف، بال۔ تابدار: پیچ دار، گھنگھریالے، روشن۔ خرد: عقل۔

شرح:

یہ بال جبریل کی تیسری غزل کا پہلا شعر ہے، یہ پوری غزل دراصل دعا ہے، اس غزل میں اقبال جذب و وجد کی کیفیات میں عاشقانہ لہجہ میں اپنے معشوق حقیقی سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں۔ گیسو سے خدا کے جمال کی تجلیات اور اس کی صفات کے مظاہر مراد ہیں، اور تابدار کرنے سے مظاہر کی کشش و جاذبیت اور تجلیات کی نورانی شدت و کثرت مراد ہے۔ دوسرے مصرع میں ہوش سے حسی ادراک کی کیفیت، خرد سے استلالی صلاحیت، قلب سے وجدانی کیفیت اور نظر سے نگاہ بصیرت مراد ہے۔

گیسوئے یار دلِ عاشق کو ماہی بے آب بھی کرتا ہے اور جمالِ رخ زیبا کے لیے حجاب بھی بنتا ہے، کائنات میں پھیلے خدا کے جمال کی تجلیات اور اس کی صفات کی جلوہ گاہیں عاشق حقیقی کا دامن دل کھینچتی ہیں، اور عاشق اپنے معشوق حقیقی کی ان تجلیات میں اس قدر بے خود ہو جاتا ہے کہ نہ اسے اپنے عقل و خرد کی خبر ہوتی ہے اور نہ قلب و نظر کا خیال ہوتا ہے، وہ اپنے پورے وجود کو بھلا کر معشوق حقیقی کے وجود میں گم ہو جاتا ہے۔

اقبال پر بھی عشق حقیقی کی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہے، وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر خدا کی ذات و صفات اور اس کی نورانی تجلیات میں کھوئے ہوئے ہیں۔

خالق کائنات کی کھوج میں حکما اور فلاسفہ کا جو قافلہ نکلا وہ ماضی قدیم سے ہی دو مختلف راہوں پر گامزن ہوا، ایک راہ خالص عقلی استدلال کا سہارا لینے والے فلاسفہ کی رہی اور دوسری راہ وجدانی کیفیات سے حقیقت کا سراغ لگانے والے فلاسفہ کی رہی، چناں چہ یونان کے مشائیہ نے عقلی استدلال والی راہ پر آبلہ پائیاں کیں اور اشراقیہ نے وجدانی کیفیات والی راہ سے اس دشت کی خاک چھانی، جدید فلاسفہ میں ڈیکارٹ (م: ۱۶۵۰) عقلیات کا امام سمجھا جاتا ہے اور برگساں (م: ۱۹۴۱) وجدانیات کا ترجمان شمار ہوتا ہے، اقبال بھی اسی وجدانی راہ کے جادہ پیما ہیں مگر یہاں اقبال نے اس وجدانی قافلے کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور فنا فی اللہ کے اس مقام پر پہنچ گئے کہ ذات واجب الوجود تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وجدانی کیفیت کے بھی محتاج نہیں رہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے خدا تو اپنے جمال و کمال اور اپنی صفاتِ لازوال کے مظاہر میں اور اضافہ کر دے، اپنی نورانی تجلیات کو اور بڑھا دے، مجھے اپنے عشق میں ایسا مست کر دے کہ نہ مجھے اپنی عقل کا خیال رہے اور نہ مجھے اپنے دل کا دھیان، میں اپنے وجود سے بے خبر ہو کر بس تیری یاد اور تیرے عشق میں مست ہو جاؤں، مجھے شرابِ لاالہ سے ایسا مخمور کر دے کہ بس تو ہی تو ہو، اور مجھے عشق کے اس نورانی مقام تک پہنچا دے جہاں عقل و خرد کے پر جل جایا

کرتے ہیں اور قلب ونظر کی آنکھیں چندھیا جایا کرتی ہیں۔

'شکار کر' کا لفظ اس شعر کی جان ہے، ایک شکاری کے جال میں جب کوئی شکار پھنستا ہے تو اب وہ مکمل طور پر شکاری کے قابو اور اختیار میں ہوتا ہے، وہ چاہے اسے رکھے یا بیچے ،کاٹے یا پالے، شکار اس کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے اللہ تو میرے ہوش وخرد اور میرے قلب ونظر کو شکار کرلے، میرے اختیار میں کچھ نہ رہے، یہ سب تیرے حکم کے تابع ہوں، تیرے ہر حکم پر میری عقل بھی لبیک کہے اور میرا دل بھی۔ تیرے کسی بھی حکم پر نہ میری عقل کوئی منطق ڈھونڈے اور نہ میرا دل کوئی سامان راحت تلاش کرے۔

خدا کی صفات وتجلیات کو گیسو سے تشبیہ دی گئی ہے، مشبہ بہ مذکور ہے اور مشبہ محذوف ہے، اس لیے یہ استعارہ تصریحیہ ہے، دوسرے مصرع میں عقل وخرد اور قلب ونظر کو شکار پرندے یا جانور سے تشبیہ دی گئی ہے، مشبہ مذکور ہے اور مشبہ بہ محذوف ہے، اس لیے یہ استعارہ مکنیہ ہے۔ پہلے مصرع میں مشبہ بہ (گیسو) کے مناسب تابدار کرنے کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، اور دوسرے مصرع میں مشبہ بہ (شکار جانور) کے مناسب شکار کرنے لفظ ذکر کیا گیا ہے، اس اعتبار سے دونوں مصرعوں میں استعارہ مرشحہ پایا جاتا ہے۔

اوسٹرا اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے کامیاب مشاعرہ پر چیرمین عبداللہ جمیل اور ناظم مشاعرہ ڈاکٹر ناہیدہ سلطانہ کو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کی طرف سے مبارکباد پیش کی جاتی ہے

ظہور ظہیر آبادی

غزل

جو ہیں سوغاتیں اپنوں کی وہ سینے میں چھپاتے ہیں
ملے جو زخم اپنوں سے کہاں سب کو بتاتے ہیں
پڑا جب وقت تو غیروں نے ہی ہم کو سنبھالا ہے
جنہیں اپنا سمجھتے ہیں وہی دامن بچاتے ہیں
دلوں سے کھیلنا فطرت رہی جن کی محبت میں
کھلونوں کی طرح اکثر وہ دل کو توڑ جاتے ہیں
لگے گی آگ ان کے بھی کبھی تو آشیانہ میں
گھروں میں آگ نفرت کی جو اوروں کے لگاتے ہیں
اڑا دیتی ہیں نیندیں بھی کبھی مظلوم کی آہیں
سکوں سے رہ نہیں سکتے جو اوروں کو ستاتے ہیں
وہ آہی جائیں گے اِک دن زمانے کی نگاہوں میں
جو اپنے اصل چہرے پر بھی اِک چہرہ لگاتے ہیں
مٹادیں جن کی خاطر خواہشیں ہم نے ظہورؔ اپنی
زمانے میں وہی تو آج کل ہم کو رلاتے ہیں

شہزادہ اختر۔ایم۔فل اسکالر یونی ورسٹی آف حیدرآباد

سرسید اور اُن کے نامور رفقا: ایک جائزہ

سرسید احمد خان (۱۸۹۸۔۱۸۱۷) اُردو ادب کی ہمہ جہت شخصیت تھے۔سرسید ادیب، صحافی، علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج کے بانی تھے۔سرسید نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اُنھوں نے مسلمانوں کو جمود سے نکالنے اور اُنہیں باعزت قوم بنانے کے لیے سخت محنت کی۔سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے روشناس کرایا اور اُن میں خود اعتمادی اور قومی شعور پیدا کرنے کی تحریک چلائی۔اُنھوں نے نہ صرف اُردو زبان کی حفاظت کی بلکہ اُردو نثر کو سہل اور سلیس بنایا۔سرسید نے ہر میدان میں اپنا نقش بٹھایا اور ہر جگہ اپنے اثرات چھوڑے۔

سرسید نے اُردو نثر کی جدوجہد کو وسیع تر کر دیا۔سرسید نے نہ صرف ادب اور زندگی کو باہم پیوند دیا بلکہ ادب اور اجتماع کے درمیان رشتہ قایم کیا۔سرسید کی تصانیف کا ممتاز ترین موضوع مذہب ہے اس پر ان کی بڑی بڑی کتابیں ''تفسیر القران'' اور ''تبیین الکلام'' ہیں۔ان کے علاوہ ان کے وہ مضامین ہیں جو انہوں نے تہذیب الاخلاق میں دینی موضوع پر لکھے۔سرسید نے اپنی تصانیف کے ذریعے اپنے زمانے کے مصنفوں اور ادیبوں کو بہت سے خیالات دیے۔سرسید کے ادب میں حقیقت زیادہ اور افسانیت کم ہے۔اُنہوں نے حاضر کو مرکزِ توجہ بنایا۔اُنھوں نے اور اُن کے رفقا نے مختلف مضامین مثلاً مذہب، تاریخ، سیاست، تعلیم وغیرہ پر قلم اُٹھایا۔

رفقا سرسید کی فہرست طویل ہے لیکن یہاں ہم نے سرسید احمد خان کے ارکانِ خمسہ سرسید، حالی، آزاد، شبلی، نذیر احمد اور سرسید کے نورتن مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، شبلی نعمانی، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، مولانا آزاد، مولوی ذکاءاللہ کے مذہبی و دینی افکار و نظریات کو موضوع بحث بنایا ہے۔

نواب محسن الملک (۱۹۰۷۔۱۸۳۷) ان کا اصل نام سید مہدی تھا ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق میں پے در پے مضامین لکھ کر اُردو زبان میں مقالہ نویسی کو مقبولِ عام کیا۔نواب محسن الملک شعیہ تھے جب کہ سرسید وہابی تھے نواب محسن الملک سرسید سے متاثر ہو کر سُنی ہو گیے۔سرسید اور محسن الملک کے باہمی تعلقات اتنے پختہ اور گہرے تھے کہ سید صاحب کبھی کبھی انہیں ''لمحک لحسی'' اور محب'' اور محبوب'' وغیرہ الفاظ سے یاد کرتے تھے۔محسن الملک ۱۸۴۳ میں سید صاحب کی سائیٹیفک سوسایٹی کے ممبر بنے۔اُنہوں نے خطباتِ احمدیہ کی تالیف میں بھی بہت مدد دی۔محسن الملک نے ہی تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون ''مذہب علم'' میں نیچر کے متعلق سرسید کے نقطیہ نظر کی نہایت عمدہ توضیح کی ہے سرسید کی طرح محسن الملک بھی امام غزالی کے فلسفۂ اخلاق اور علمِ کلام سے متاثر ہیں۔نواب محن الملک نے ایک خط میں لکھا:

''مجھ سے زیادہ سرسید کا جاننے والا، ان کی عزت کرنے والا، ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں۔۔۔۔۔۔۔''

نواب محسن الملک کی ساتھ تصانیف یہ ہیں (۱)مضامینِ تہذیب الاخلاق (۲)مکمل مجمو ء لیکچرز (۳) بالحدیث (۴) کتاب الجحت واشوق مکاتیب (۵) مسلمانوں کی تہذیب اور آیات (۶) تقلیدِ عمل اس کے علاوہ ان کے مضامین تہذیب الاخلاق کی ایک مکمل جلد (اول) ہے۔

مولوی چراغ علی: مولوی چراغ علی (۱۸۴۵ ۔۱۸۹۵) جدیدیت کے علمبردار تھے۔وہ اصل میں کشمیری تھے۔ان کے آباواجداد کشمیر سے پنجاب آیے تھے۔ان کا علی گڑھ تحریک سے علمی تعلق تھا۔وہ تہذیب الاخلاق کے اہم مضمون نگار تھے۔سرسید اور چراغ علی کے بارے میں ڈاکٹر انور سید لکھتے ہیں:

''تہذیب الاخلاق میں مولوی چراغ علی نے متعدد مضامین لکھے اور سرسید کے موقف کی صراحت کی۔اُنہوں نے علی گڑھ کے افکار وخیالات کو اس خوبی سے پھلایا کہ یہ عام لوگوں کے مزاج کا حصہ بن گیے۔اور تحریک کامیابی کی منزلیں سر کرنے لگی۔'' (ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص:۳۲۵)

مولوی چراغ علی نے اکثر کتابیں انگریزی میں لکھی۔ان کی انگریزی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

(1) CRITICAI ANALYSIS OF THE POPULAR JEHAD

(2)REFORMS UNDER MUSLIM RULE

(3)MUHAMAD:THE TRUE PROPHET

ان کی اُردو کتابوں کے نام یہ ہیں:

'تعلقات' اسلام کی دینوی برکتیں' قدیم قوموں کی تاریخ' بی بی حاجرہ ماریہ قطیبہ' تعلقِ نیاز نامہ۔انہیں ایک اور کتاب لکھنے کا ارادہ تھا جس کا نام 'العلوم جدیدہ والاسلام' تجویز ہوا تھا مگر موت نے فرصت نہ دی۔ان کے کچھ رسایل ''رسایلِ چراغ'' کے نام سے بھی طبع ہو چکے تھے۔

مولوی چراغ علی سرسید کا بایاں بازو سمجھے جاتے تھے۔ان کی علمی قابلیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے۔کہ سید صاحب نے اپنی آخری کتاب تفسیرالقرآن'' میں مولوی صاحب کے نظریات وخیالات سے خوشہ چینی کی ہے۔

مولوی چراغ علی کی معلومات کے ماخذ وسیع تھے۔انہیں براہِ راست عربی' فارسی' عبرانی' انگریزی وغیرہ پر دسترس حاصل تھی۔مولوی چراغ علی کے نظریات اس امر کی عمدہ مثال ہے کہ آقاوں کے مفادات غلاموں کے ذہنوں کو کس طرح جکڑ لیتے ہیں۔مولوی چراغ علی نے جدید علم الکلام میں چند جدید مسائل پر بحث کی ہے جن میں عورت مرد کی گواہی میں مساوات' اسلامی پردے سے دست برداری' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

نذیر احمد: سرسید کے رفقا میں ایک اور نامور شخصیت نذیر احمد شامل ہیں۔ان کا اصل میدان ناول ہے جس کی وجہ سے انہوں نے شہرت پایی۔نذیر احمد نے بھی سرسید کی طرح قوم کی اصلاح کی۔سرسید سے اتفاقِ رایے کی وجہ سے لوگ انہیں بھی ''نیچری'' کہتے تھے۔ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ اسلام ترقی کے منافی نہیں ہے۔نذیر احمد کا سرسید کے عقاید میں بہت سی جگہوں پر اتفاق رایے تھا وہ سرسید کی طرح رایے اور عقل پر زور دیتے تھے۔نذیر احمد اپنی اکثر کتابوں میں جدید تعلیم کی حمایت کرتے ہیں۔انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مذہب فطرت کے عین مطابق ہے۔

نذیر احمد کی قابلِ ذکر تصانیف میں ترجمہ قرآن مجید اور ان کی مشہور ''کتاب الحقوق والفرایض'' ہے۔اس کتاب کی

خصوصیت یہ ہے کہ یہ ٹھیٹھ اردو زبان میں ہے اور اُردو کا پہلا استوار اور بامحاورہ ترجمہ ہے۔ان کی دوسری تصنیف ''الحقوق والفرایض'' ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔اس میں عقاید'عبادات 'معاملات'معاشرت کے متعلق خاص اسلامی نقطۂ خیال سے بحث کی گیی ہے۔

شبلی نعمانی:شبلی اپنے بھائی کے داخلے کے لیے علی گڑھ کالج گیے تھے۔وہی ان کی ملاقات سرسید سے ہویی اور وہ وہی کے ہو کر رہ گیے۔سرسید نے شبلی کو مدرستہ العلوم کا پروفیسر مقرر کیا۔یہی شبلی کی ملاقات آرنلڈ سے ہوئی۔شبلی نے اپنی اکثر تحریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کو جدید علوم اور جدید تمدن سے مطابقت دی جایے۔

سرسید اور شبلی کے دینی نظریے میں فرق یہ ہے کہ سرسید قدیم کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اس سے تمدن اور زندگی کے نیے رجحانات کی تاید ہو۔ان کے برعکس شبلی جدید رجحانات کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے قدیم عقاید کی تاید نکلتی ہو۔سرسید کے رفقا میں شبلی ایک ایسا شخص ہے جو ان سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے بعض تصورات کا سب سے بڑا باغی ہے۔اس کے باوجود شبلی کے ذہنی ارتقا میں سرسید کا گہرا اور نمایاں حصہ ہے۔شبلی کو شبلی بنانے والے سرسید ہی تھے۔شبلی کا وہ رنگِ تصنیف جس نے ان کو اردو ادب کا عظیم رُکن بنایا وہ سرسید ہی کی رفاقت اور ہم نشینی کا ثمر ہے۔

مولوی ذکا اللہ:سرسید کے رفقا میں شبلی کے بعد اگر کویی شخص مورخانہ امتیاز کا مالک ہے تو وہ مولوی ذکا اللہ ہے۔ان کا بڑا کارنامہ ''تاریخ ہندوستان'' ہے ذکا اللہ کے نزدیک تاریخ کی علمی قدر ومنزلت یہ ہے کہ:

''اس نے علمِ معاشرت وتمدن کو یہ توضیح وتفصیل بیان کیا ہو اور قوموں کی سوانح عمری اس طرح سے بیان کرے کہ ان کی تمدنی معاشرت کا باہمی مقابلہ کا سامان بہم پہنچ سکے تا کہ آئیدہ زمانے کے لیے ان قطعی قوانین کا تصفیہ ہو جایے۔جن کے مطابق تمدنی واقعات پیش آتے ہیں۔'' (سرسید اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ،سید عبداللہ،ص:۳۳۴)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولوی ذکا اللہ کو سرسید کے نامور رفقا میں شامل کیا ہے۔اور ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے بچوں تک سرسید کا پیغام پہنچایا۔ان کا شمار تحرکِ علی گڑھ کے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کی تصانیف کی تعداد (۱۴۳) لکھی ہے جن میں ۸۱ ریاضی پر جبکہ ۱۷ کتابیں تاریخ اور جغرافیہ پر ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید مولوی ذکا اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''سرسید کو ان کی عظمت وجلالت کی بنا پر قبول کر لیا گیا لیکن مولوی ذکا اللہ چوں کہ سرسید کے پیچھے کھڑے تھے اس لیے ان کی استدلالی نثر کی پوری تحسین نہ ہوئی۔'' (اردو ادب کی تحریکیں،انور سدید،ص:۳۳۰۔۳۳۱)

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴) علی گڑھ تحریک کے سرگرم رُکن تھے۔انہوں نے سرسید احمد خان کے عقاید ونظریات کا پرچار کیا۔سرسید احمد خان سے ان کی مماثلت'عقلیت وفطرت پرستی کے حوالے سے قابلِ ذکر ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے اپنی نظم ونثر میں کیا ہے۔مولانا حالی

اپنے مربی اور رہنما کو امامِ وقت تسلیم کرتے ہیں۔یہ ان کی مذہبی جسارت ہے۔چناچہ لکھتے ہیں کہ:

''ان کی بعض باتوں پر الہامی ہونے کا گمان ہوتا ہے اور بعض انتہا درجے کی رکیک اور نحیف معلوم ہوتی ہے'مگر یہی وہ لوگ ہیں جو علومِ دینیہ میں اپنے اپنے فن کے امام مانے گیے ہیں۔ان کی غلطیوں سے دین کو کویی نقصان نہیں پہنچا۔مگر ان کی

متوحاتِ جدیدہ سے اسلام کو بے انتہا قوت پہنچی ہے''۔

اسلام کو دین فطرت ثابت کرنے کے لیے حالی نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ دین سادہ اور آسان ہے۔اسے مولویوں نے مشکل بنادیا ہے۔اس سلسلے میں مولانا حالی رقمطراز ہیں کہ:

''جو باتیں رسولِ خدا نے محض اصلاحِ معاش کے لیے تعلیم فرمائی تھیں اور جن کا مدار صرف مصالح دینوی پر تھا۔وہ بھی شریعت میں داخل کی گئیں ۔عقایدِ باطلہ اوراخلاق رذیلہ کی اصلاح تو رسول کا منصبی فرض ہے اور معاش کے بارے میں تعلیمی منصبی فرایض سے بالکل علیحدہ ہے۔اردوادب میں مولانا حالی کو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی ثناخوانی کا بھی شرف حاصل ہے۔وہ مسلمانوں کی عظمت وعظمت چ وثناخوانی کے گن گاتے ہیں۔''

سرسید اور حالی کے نزدیک دین اور دُنیا' مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں۔دونوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ترقی کا راز عربی معاشرت اور تمدن پر منحصر نہیں بلکہ ترقی کا دارومدار مغربی معاشرت پر ہے جس کا اظہار سرسید نے علی الاعلان کیا تھا جبکہ مطلانا حالی نے خاموشی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا۔مولانا حالی یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔مذہب کا تعلق انسان کے جسم سے نہیں بلکہ نفس یا جذبات سے ہے۔چناچہ مولویوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''ان کی تمام ہمت اور توجہ طہارت ظاہری اور احکام جسمانی کی طرف مصروف ہوگئی اور طہارتِ باطنی اور تہذیبِ روحانی جو کہ اصل مقصود تھی بالکل فراموش ہوگئی۔مولانا حالی سرسید احمد خان کے خیالات ونظریات سے کوئی اختلاف نہیں کرتے۔نہ ہی انہوں نے سرسید احمد خان کے عقاید ونظریات کا پرچار کیا ہے البتہ وہ سید صاحب کی شخصیت سے پوری طرح مرعوب تھے اس بات کا اظہار انہوں نے سرسید کی سوانح عمری حیاتِ جاوید ۱۹۰۵ میں بھرپور انداز میں کیا ہے۔''

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سرسید اوران کے نامور رفقائے کار نے جس طرح قوم کی بہتری کے لیے تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دیے وہ ناقابلِ فراموش ہیں اور جب تک علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جیسا ادارہ قایم ودایم ہے تب تک دُنیا ان کی خدمات کو یاد کرتی رہے گی۔

(بقیہ ص:۳۵/کا)

دمولانا نے اپنے اطمینان کی خاطر تجربہ کے لئے سورہ بقرہ کی ایک عبارت ایک پندرہ سالہ لڑکے اور ایک ایسے شخص سے پڑھوایا جس نے بڑی عمر میں پڑھنا لکھنا سیکھا تھا،دونوں نے بہ آسانی پڑھا اور سمجھا بھی۔

یہاں پر یہ نقل کرنا بیجانہ ہوگا کہ قرآن مجید کی ترجمہ نگاری وتفسیر نویسی کا لفظیاتی ملبوس مولانا آزاد نے اس طور پر تیار کیا کہ سرسید کی سہل ممتنع نگاری،محمد حسین آزاد کی ندرت بیانی،حالی کی روانی،ڈپٹی نذیر احمد کی قادرالکلامی اور شبلی نعمانی کی جامعیت وطاقتِ لسانی سب کے اجزائے ترکیبی کو اپنے میزانِ ذوق کے پلہ پر تول تول کر باقاعدہ تناسب ملایا اور رنگ وآہنگ کا خاص حصہ اپنے حسنِ طبیعت سے مزید بڑھایا۔اس طرح وہ اسلوبِ خاص تیار ہوا جو فکر ونظر کی بلند وعمیق روح پر راست آیا۔

''ترجمان القرآن''مع سورہ فاتحہ مولانا آزاد کی زندگی کا ایک معجزہ ہے۔اپنے وقت کے ماہرین قرآن اور اکابرین نے مولانا کے ترجمہ وتفسیر کی جو ستائش کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ''ترجمان القرآن'' کا مولانا آزاد کی جانب سے پیش کیا جانا اردو زبان کے پڑھنے والے مسلمانوں کے لئے بیسویں صدی کا ایک عظیم تحفہ ہے جو صرف اٹھارہ پاروں تک ہی محدود رہ سکا۔افسوس کہ مولانا کی زندگی وفا نہ کرسکی ورنہ ہم مکمل قرآن کے ترجمہ وتفسیر سے استفادہ کرسکتے تھے۔

آبیناز جان علی۔ موریشس

ایک غلطی

پانپلے موس کے باغ کے وسیع وعریض سفید دروازے پر نظریں دوڑاتے ہوئے ننھی شائستہ کی چھوٹی گول آنکھیں حیرت واستعجاب کے عالم میں چمکنے لگتیں۔ فرانسیسیوں کے زمانے کا یہ شاندار پھاٹک جس پر حال میں سفید رنگ چڑھایا گیا تھا اپنے ماضی کی عظمت کا علمبردار ہے۔ جب شائستہ ان بڑے دروازوں سے گزرتی تو چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی۔ آس پاس کووں کا شور فضا میں سنسنی پیدا کرتا۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں آپس میں ملی ہوئی باغ کے مختلف جوانب میں سیر کرنے والوں کو لے جاتیں۔ یہاں وہاں سفید بنچ نظر آتے۔ ہر گلی کا اپنا نام ہوتا۔

'چالرس ڈاروین گلی، پرنسیس ماگریٹ گلی، لیڈی بارٹی گلی۔۔۔'

شائستہ ان کو بآوازِ بلند پڑھتی جاتی اور انہیں یاد کرنے کی پوری کوشش کرتی تاکہ اسکول میں اپنے استاد کو اپنی قوتِ حافظہ سے متاثر کر سکے۔ شائستہ کا خاندان ہمیشہ باغ کے بیچ کا راستہ لیتا۔ بڑے چوکور تالاب کے پاس رک کر عظیم واٹر لی لی کا دیدار کرتے۔ شائستہ ان بڑے واٹر لی لی کے نیچے دیکھنے کی کوشش کرتی لیکن وہ پتے اتنے بڑے تھے کہ نیچے کا پانی بمشکل نظر آتا اور پانی میں گرنے کا ذرا خوف بھی ہوتا۔ لکڑی کے پلوں پر سے گزرتے ہوئے شائستہ کھل کھلا اٹھتی۔ نیچے بہتے ہوئے پانی کا شور اسے مسرور کرتا۔ وہ ندی کے درمیان لکڑی اور پام کے سوکھے پتے سے بنائے گئے بڑے چبوترے کے نیچے کچھ دیر بیٹھتے اور مچھلیوں کے کھانے کے لئے سوکھی روٹی پھینکتے۔ آنِ واحد میں مچھلیوں کا ہجوم سطحِ آب پر نظر آتا۔ سب روٹی کا ایک لقمہ حاصل کرنے کی کوشش میں پانی کے کنارے بے خوف وخطر آجاتے۔ چاروں طرف اونچے اور گھنے سایہ دار درخت کو دیکھ کر شائستہ عش عش ہوتی۔

'وہ دیکھئے ابو، بطخ پانی میں تیر رہا ہے۔'

اس کے بعد شائستہ سوکھی گھاس اٹھا کر ہرنوں کو کھلاتی جو بے نیازی شان سے سیاحوں کے سامنے جلوہ گر تھے۔ ایک فرانسیسی سیاح پر نظر پڑتے ہی شائستہ نے اس سے فرانسیسی زبان میں دریافت کیا: 'ایسک کے وٹر سے ژور آ موریس سے پاس بئیں؟' (کیا موریشس میں آپ کا سفر خوب گزر رہا ہے۔)

'وی وی۔' سیاح نے جواب دیا تھا۔

شائستہ بھاگتی ہوئی ابو کے پاس گئی۔ 'ابو ابو میں نے ایک فرانسیسی سیاح سے بات کی۔' ابو مسکرائے۔

گنے کے کارخانے کی تاریخی عمارت اور بابائے قوم سر سیو ساگر رام غلام کی سمادھی سے گزرتے ہوئے ابو شاتودے موں پلیز زیر کے سامنے ایک بڑی چادر بچھاتے۔ سارا سامان رکھ کر امی بریانی نکالنے میں عدیم الفرصت رہتیں۔ چاول، گوشت اور مصالحہ کی آمیزش کا ذائقہ ہوا میں پھیل جاتا۔ شائستہ جلدی جلدی کھانے سے فارغ ہو کر وسیع میدان میں اپنی بہن تاشرین کے ساتھ یہاں وہاں بھاگتی۔ گھاس پر لوٹتی، کنول کے مجسمے کے گرد جاتی اور حیرت سے تمام پودوں سے لگے ہوئے پتھروں میں تراشے گئے نام کو فخر سے پڑھتی جن کو مختلف ممالک کے وزراء اور صدور نے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے: ہندوستان، چین، انگلینڈ۔۔۔ شائستہ پڑھتی جاتی۔

شائستہ کو یاد تھا جب تاشرین پیدا نہیں ہوئی تھی وہ ایک بڑے درخت کو دیکھنے آئے تھے جو سو سال میں ایک ہی بار پھول دیتا ہے۔ وہ دو سال کی تھی جب اسے لکڑی کی بنائی گئی اونچی سیڑھی

چڑھنی پڑی تھی۔ ابو نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑا تھا اور اسے چڑھنے میں مدد کررہے تھے۔ اگلے روز دونوں زانوؤں کا درد بھی یاد ہے۔ تاشرین کے آنے کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ گھر میں جو کچھ آتا اس کے دو حصّے ہوجاتے۔ پھر تاشرین کو بھی اکثر وہی چیز پسند آتی جو شائستہ کو ملتا۔ ایک بار ابو نے آنگن کے پیڑ سے ناریل توڑے۔ ناریل کو اوپر سے چھڑی کی مدد سے چھیلنے کے بعد برتن میں اس کا پانی انڈیل دیا گیا۔ پھر اس کو بیچ سے الگ کرنے کے بعد شائستہ کو ملائی کھانے کے لئے چمچ کے ساتھ دے دیا۔ کچھ دیر بعد تاشرین کے رونے کی آواز سنائی دی:

'کیا ہوا؟' ابو نے پوچھا۔

'میرا والا بیچ میں جڑا ہوا نہیں ہے، شائستہ کی طرح۔'

'دونوں ٹکڑوں کو ایک ساتھ کردو۔ ایک ہوجائے گا۔'

'نہیں مجھے دونوں حصّے ساتھ میں جڑا ہوا چاہئے۔'

تاشرین کو شائستہ کی ہر چیز عزیز تھی۔ شائستہ کے ایک ہیڈ بینڈ میں چھوٹی گھنٹیاں تھیں اور ایک چھوٹا ٹیڈی بھی تھا۔ تاشرین نے ضد کر کے وہ ہیڈ بینڈ لے لیا اور منٹوں میں اس کے پرزے پرزے کرڈالے۔

شائستہ اپنا غصّہ پی کے رہ گئی۔ امّی نے بھی تو کچھ نہیں کہا تھا۔

'ابھی چھوٹی ہے۔'

'لیکن یہ میری چیز ہے۔ مجھ سے پوچھے بغیر کیسے لے لی؟'

یہ بچپن کی باتیں تھیں لیکن ابھی بھی اثر رکھتی تھیں۔

آج تاشرین ایس۔ایس۔ آڑ میڈکل کالج سے ایم۔ بی۔بی۔ایس کی ڈگری جلد مکمل کر کے ایس۔ایس۔آڑ قومی ہسپتال میں پریکٹیس شروع کرنے والی ہے۔ تاشرین والدین کی فرمانبردار اور لائق فائق بیٹی ہے۔ یہ باتیں سوچتے ہوئے شائستہ نے نمبر ملایا:

'جاگ رہے ہو؟'

'رات بھر نیند نہیں آئی۔ ابھی سونے کی کوشش کررہا ہوں۔' فون پر عرفان کی آواز سنائی دی۔

'میں نے ابھی پریگننسی ٹیسٹ لیا ہے۔ نتیجہ مثبت آیا ہے۔'

'کیا؟'

'ہاں۔ آج ملتے ہیں۔ آٹھ بجے۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔'

'ٹھیک ہے۔'

عرفان سے بات کرتے ہوئے شائستہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ صبح کے چار بجے تھے۔ کئی دنوں سے شائستہ کو حاضمہ کی پریشانی ہورہی تھی۔ اس کے مسوڑھوں میں سوجھن آگئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی کھانا برداشت کے باہر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کوکھ میں جیسے ایک بوجھ تھا جو اتر نہیں رہا تھا۔ عرفان نے تو کہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا۔

پورٹ لوئی کے بس اڈے پر عرفان کو آتے ہوئے دیکھ کر شائستہ کو اس کی سچی محبت کا یقین ہوگیا۔ یہ لڑکا اسے مصیبت میں چھوڑ کر جانے والا نہیں ہے۔

'اس بچے کو جانا ہوگا۔ شادی کے باہر پیدا ہونے والے بچے کا مستقبل کیا ہوگا۔ دینا اسے قبول نہیں کرے گی۔'

'دنیا کیا کہے گی؟ اب ہماری شادی کی عمر ہوگئی ہے۔ غلطی تو سب سے ہوتی ہے۔ ہم نکاح کرلیں گے شائستہ۔'

'نہیں ابو یہ ذلت برداشت نہیں کرپائیں گے۔ ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا۔'

'لوگ تو بچوں کے لئے ترستے ہیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود ان کا آنگن سونا رہتا ہے اور تم بچہ نہیں چاہتی؟ معلوم نہیں اگلی بار خدا ہمیں اولاد دے گا یا نہیں۔ کہیں بدعا نہ لگ جائے۔'

تاثرین کی تصویر شائستہ کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

'نہیں ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا۔ ایک ہی مہینہ گزرا ہے۔ دوائی سے چلا جائے گا'

'لیکن ڈاکٹر کو نہیں بتانا ہے کہ شادی نہیں ہوئی ہے'

عرفان نے اس بات پر زور دیا۔

'ٹھیک ہے'

ڈاکٹر شیلا کا ذاتی مطب سرسیوساگر گلی اور ولیم نیوٹن گلی کے بیچ میں واقع تھا۔ انگریزوں کے زمانے کا بنا ہوا کالے پتھروں کی یہ عمارت اندر سے اور زیادہ بوسیدہ معلوم ہوتی تھی۔ چپراسی فرش کو آج بھی لال پالش اور ناریل کے سوکھے پھل کو برش کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ عرفان اور شائستہ کو اندر آتے دیکھ کر چپراسی نے مشکوک نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور انہیں لکڑی کی بنچ پر بیٹھنے کے لئے کہا اور ڈاکٹر شیلا کو اطلاع دینے کے لئے اندر چلا گیا۔ شائستہ نے پتھر کی دیواروں پر نظر دہرائی تو ایک مسکراتا ہوا عریاں بچے کی تصویر دکھائی دی۔ بغل میں چند نامور دوائیوں کے اشتہارات بھی تھے جن میں خوشحال والدین اپنے بچے کا ہاتھ تھامتے ہوئے اٹھتے ہوئے سورج کی طرف جا رہے تھے۔

ڈاکٹر شیلا کی موٹی عینک دلیل فراہم کر رہی تھی کہ انہوں نے زندگی کے کئی سرد و گرم دیکھے ہیں۔ اپنی کرسی پر اطمینان سے بیٹھتی ہوئی آپ نے اپنے گاہک سے ان کے آنے کی وجہ پوچھی۔

'میں نے آج صبح پریگنینسی ٹیسٹ کیا ہے۔ اس پر دو لکریں تھیں'

'تو آپ حاملہ ہیں'

'جی۔۔ہمم۔۔۔ ہماری ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ ہمیں ابھی بچہ نہیں چاہئے'

'بچے کے آنے سے سب کچھ بدل جاتا ہے'

ڈاکٹر شیلا نے اطمینان سے کہا۔

'دراصل ہم نے ابھی مکان نہیں بنایا ہے۔ ایک کمرے میں رہ رہے ہیں۔ بچے کی پرورش مشکل سے ہو پائے گی'

'ہم جلد ہی آسٹریلیا جانے کی سوچ رہے ہیں'

عرفان نے کہا۔

ڈاکٹر شیلا نے تھوڑی دیر سکوت کے بعد کہا: 'ویسے ایک دوائی تو ہے جس سے وہ چلا جائے گا۔۔۔میں آپ کو لکھ کر دے دیتی ہوں لیکن اس کو لینے سے پہلے اپنے خدا کے سامنے اپنا محاسبہ ضرور کر لیں۔ بچہ سب کو نہیں ملتا' شائستہ نے چڑ کر غور کیا کہ چپراسی دروازے پر کھڑا سب سن رہا تھا۔

'ان دوائیوں کو دن میں تین بار لینا ہے۔ خون کو روکنے کے لئے پانی میں ادرک گھول کر پی لینا۔ اگر پھر بھی نہ رکے تو آپ کو آپریشن کرنا ہوگا'

عرفان دوا خانے کے اندر نہیں گیا۔ دوائی لینے کے بعد وہ شائستہ پر بھرک اٹھا:

'تم میرے بچے کو مار رہی ہو'

'کبھی سوچا ہے میرے دفتر کے لوگوں کو معلوم پڑے گا تو وہ کیا سوچیں گے؟' شائستہ تس سے مس ہونے والی نہیں تھی۔

گھر پہنچتے ہی اس نے ایک گولی کھائی۔ دو گھنٹے بعد بھی کچھ نہیں ہوا۔ شام کو سب کی نظروں سے خود کو بچاتے ہوئے اس نے ایک اور گولی لی۔ کچھ دیر بعد اسے بوجھ کے اترنے کا احساس ہوا۔ اپنے خون کو جاتے ہوئے دیکھ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

'میرا بچہ۔۔۔میرا بچہ۔۔۔'

شائستہ نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ اس اندیکھے خون کے لقمے پر اسے کبھی پیار آسکتا ہے۔ ممتا کے احساس نے اسے شکست خوردہ کر دیا۔ آنے والے تین دنوں میں شائستہ نے تین

تین گولیاں کھائیں۔ شروع میں دوائی کی شدت سے وہ کانپنے لگتی اور اس قدر ٹھنڈ محسوس کرتی کہ وہ اپنے کمرے میں اکیلی کمبل کے نیچے سہم جاتی۔ تیسرے دن جب یہ شدید احساس کم ہوتو اس نے دیکھا کہ اس کے دائیں بازو میں ایک بھیانک پھوڑا نکل آیا جسے وہ اپنی لمبی آستین کے نیچے چھپانے لگی۔ اس بدنما داغ کو دیکھتے ہوئے اسے یاد آیا کہ ایک بار عرفان کے ہونٹوں کے قریب ایسا ہی پھوڑا نکل آیا تھا۔ عرفان کو رات میں نیند نہیں آتی تھی۔ وہ عرفان کو تین مہینوں سے ہی جانتی تھی۔ ایک مہینے کے اندر اندر عرفان کے گھر والوں نے اس کے ابو سے اس کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔ اس رشتے نے اوس کی بوندوں کی طرح شائستہ کی زندگی کو تازگی بخشی تھی اور اس خوشی کو برقرار رکھنے کے لئے شائستہ نے خود کو عرفان کے حوالے کر دیا تھا۔ اشکِ ندامت نے اس کے دامن کو تر کر دیا۔ اس اثنا میں شائستہ کو اپنی امّی یاد آئی جس کی ممتا کی نرم چھاؤں نے تپتی دھوپ میں جھلس کر اسے راحت پہنچائی تھی۔ جس کی کئی راتیں اور جس کی نیندیں اس پر قربان ہوگئی تھیں۔ ماں کیا ہوتی ہے ماں بننے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکیہ نے اپنے سائیکل کی گھنٹی بجا کر شائستہ کے خیالات کو برہم کر دیا۔ امّی نے دروازہ کھول کر ڈاکیہ کو سلام کرنے کے بعد گلابی کاغذات پر دستخط کر کے خط شائستہ کے حوالے کیا۔ لفافے پر یونیورسٹی کا مہر تھا۔ شائستہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

ایک مہینے پہلے اس نے امتحان دیا تھا جس کے نتائج اس کے ہاتھ میں تھے۔ عرفان ہر روز ملنے پر بضد ہوتا۔

'تم نے بی۔اے مکمل کر دیا۔ اچھی نوکری بھی مل گئی ہے۔ آگے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔'

'مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔ ابو چاہتے ہیں کہ میں پڑھائی جاری رکھوں۔ میری چھوٹی بہن جلد ڈاکٹر بننے والی ہے۔'

'پڑھائی میں کیا رکھا ہے۔ میں گاڑیوں کا اپنا بزنس کرتا ہوں۔ پیسے آتے رہتے ہیں۔ ایک گاڑی بک جائے تو تمہاری سال بھر کی تنخواہ سے بھی زیادہ پیسے ملتے ہیں۔'

شائستہ کے آنسوؤں نے ایم۔بی۔اے کی پہلی سہ ماہی امتحان کے نتائج کو تر کر دیا۔ وہ تین مضامین میں ناکام ہوئی تھی۔

'میں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوگیا۔ امّی سے چھپاتے ہوئے شائستہ نے اپنے آنسو پونچھے۔'

'پرچے ذرا مشکل تھے امّی۔ پھر ملازمت کرنا اور پڑھائی کرنا آسان نہیں۔ ایم۔بی۔اے کی ڈگڑی کا معیار زیادہ بلند بھی ہے۔'

'تمہارے ابو نے اس کورس کے لئے بلا تردد پچاس ہزار روپے دئے تھے۔' شائستہ کا دل کانپنے لگا۔

اتوار کو پورا خاندان پانپلے موس باغ میں موں پلے زیرِ محل کے سامنے ہری گھاس پر ایک بڑی چادر بچھائے امّی کی بریانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بریانی کی خوشبو ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ ابو اپنے خاندان کو فرطِ محبت سے دیکھ کر بولے:

'مجھے اپنی بیٹیوں پر ناز ہے۔ تاشرین ڈاکٹر بننے والی ہے اور شائستہ اچھے عہدے پر فائز ہے۔ تم دونوں نے میرا نام روشن کیا ہے۔ لیکن یاد رکھو زندگی کبھی بھی نہیں رکتی۔ ماضی کی کامیابی مستقل کی کامیابی کا ضامن نہیں ہے۔ انسان کو کوششِ پیہم کرنا ہے۔ اپنی نوکری میں خوب محنت کرو۔ آگے بڑھتے جاؤ۔ میرا کوئی بیٹا نہیں تو کیا ہوا، میری بیٹیاں میرا نام روشن کریں گی۔' شائستہ نے شرم سے اپنا سر جھکا دیا۔

'تم دونوں جب چھوٹی تھیں تو ہم سب یہاں آیا کرتے تھے۔ شائستہ اور تاشرین کھلے میدان میں ہرنیوں کی طرح پھدکتی رہتی تھیں۔'

'مجھے اچھی طرح یاد ہے ابّو۔۔۔ میرے لئے میرا خاندان سب سے اہم ہے۔' شائستہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

المعارف دارالمطالعہ پورہ معروف مئو میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی وفات پر تعزیتی پروگرام

اردو کے مشہور ادیب وشاعر ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کے سانحۂ ارتحال پر المعارف دار المطالعہ پورہ معروف، ضلع مئو۔ یوپی میں ایک تعزیتی مجلس منعقد کی گئی، جس کی صدارت جامعہ مظہر العلوم بنارس کے سابق استاد مولانا حبیب الرحمٰن معروفی نے فرمائی۔ تلاوت کلام اللہ سے پروگرام کا آغاز ہوا، نعت شریف کے بعد پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے مولانا نوشاد قاسمی استاد مدرسہ منبع العلوم خیرآباد نے مرحوم کا تعارف کرایا اور چند تعزیتی کلمات کہے" ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ہمہ جہت تھی، میں حیران ہوں کہ ان کو کس خانے میں رکھوں؟ کیونکہ جہاں وہ ایک کامیاب مدرس تھے، وہیں تحقیق وتنقید کے میدان کے شہ سوار بھی تھے، انھوں نے اپنی زبان سے طلبہ کو اردو زبان وادب کی باریکیاں بتائیں تو قلم کے ذریعے نثر ونظم میں تخلیقی جواہر پارے بکھیرے۔

مولانا صفی اللہ صدر مدرس مدرسہ تعلیم القرآن نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی موت اردو دنیا کے لیے ایک ناقابل تلافی خسارہ ہے۔

مدرسہ انوار العلوم پلیا، ادائی، اعظم گڈھ کے ناظم مولانا مطیع اللہ مسعود قاسمی نے اپنی تقریر میں بتایا کہ مرحوم ڈاکٹر صاحب بڑے انشاپرداز اور خوش فکر شاعر تھے، ان کا مقام ادبی دنیا میں بہت بلند تھا، مگر اسی کے ساتھ وہ چھوٹے اور نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔

مولانا انصار احمد معروفی استاد مدرسہ چشمۂ فیض ادری نے کہا" ڈاکٹر صاحب ماہر قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر تعلیم بھی تھے، اسی لیے ان کی اس موضوع پر کئی ایک اہم کتاب شائع ہوئیں اور طلبہ کی رہنمائی کے لیے راہبر بنیں۔ وہ بہت زود نویس تھے، مگر اس کے باوجود ان کی تحریریں جامعیت کے ساتھ گہرائی وگیرائی لیے ہوئے ہوتی تھیں۔

مولانا ابو ہریرہ یوسفی ریسرچ اسکالر مولانا آزاد یونیورسیٹی حیدر آباد نے اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ ان کا اصل میدان تعلیم اور فروغ تعلیم ہے۔ تعلیم کے موضوع پر ان کی کئی کتابیں بالخصوص" مولانا قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات" کے بارے میں اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے جتنے نپے تلے انداز میں تجزیہ کیا ہے وہ دوسرے سے مشکل ہے۔ مرحوم کو یہ دولت حاصل تھی کہ انہیں نثر ونظم پر یکساں قدرت حاصل تھی۔

مولانا شاکر عمیر معروفی استاد جامعہ احیاء العلوم مبارک پور نے اپنی جامع تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی اردو دنیا میں مقبولیت کی دلیل کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے تعارف کے لیے ڈاکٹر ظہیر حسن ظہیر نے مختلف اہل قلم سے مضامین لکھوا کر ایک جامع اور ضخیم کتاب مرتب کی، جس کا نام" ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، شخصیت اور جہات" ہے۔

مولانا ارشاد خلیل معروفی قاسمی شیخ الحدیث کلیۃ الہاجرہ للبنات پورہ معروف نے ایک مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب تعلیمی میدان کے آدمی تھے، اور چاہتے تھے کہ طلبہ میں ترقی کی دھن اور آگے بڑھنے کا جوش پیدا ہو، انہوں نے اس کے لیے کئی کتابیں تصنیف کیں، مگر ایک بار انہوں نے بتایا کہ اعلی امتحانوں میں کامیابوں کے میں نے طلبہ کی خاطر کوئز کے طور بڑی ضخیم کتابیں تیار کی ہیں، جسے میں خود شائع نہیں کرسکتا، ان کی پندرہ تصانیف کے علاوہ اتنی ہی اور غیر مطبوعہ کتابیں ہیں جو اشاعت کی منتظر ہیں۔

حافظ وقاری ولی محمد زاہد ہریانوی۔
ادیب کامل جامعہ اُردو علی گڑھ

نعتِ رسول علیہ وسلم

مکیں دیکھے مکاں دیکھا، زمیں دیکھی زماں دیکھا
نظر اُس کی مکاں پر کیوں ہو، جس نے لامکاں دیکھا

کیا اعلان آقاؐ نے صفا سے جب نبوّت کا
تو پھر کفارِ مکہ کا ستم سب نے عیاں دیکھا

ستم ڈھایا نبیؐ پر اس قدر طائف کے لوگوں نے
کہ آنسو خون کے رُوتے ہوئے یہ آسماں دیکھا

خدا سے لے لیا کرکے دُعا مردِ مجاہد کو
عمرؓ میں پیکرِ حق کو نبیؐ نے جب نہاں دیکھا

محمدؐ مصطفےٰ تشریف لائے جب مدینے میں
فِدا اُن پر مدینے کا ہر اک پیر و جواں دیکھا

صحابہؓ نے کٹادیں گردنیں اسلام کی خاطر
ہٹے پیچھے نہیں وہ اور نہ سوئے آسماں دیکھا

عجب ہوگا وہ چودہ سو برس پہلے کا منظر ہی
مدینے کو تو ہم نے آج بھی جنت نشاں دیکھا

جھلکتا ہے در و دیوار سے چاہت کا سرچشمہ
خلوص و پیار بھی اہلِ مدینے کا عیاں دیکھا

سکونِ قلب ملتا ہے مدینے کی فضاؤں میں
مدینے میں برستا نور ہم نے بیکراں دیکھا

نبیؐ کے روضۂ اطہر پہ دینے حاضری اپنی
ہمیشہ عاشقوں کا ہم نے اک سیلِ رواں دیکھا

فراقِ غم میں آقاؐ کے مرے نکلے ہیں جب آنسو
اُمنڈتا سب نے اے زاہد وہ بحرِ بیکراں دیکھا

قارئین کے خطوط

ایڈیٹر ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد

سلام مسنون.....امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے

محبّ گرامی ابوہریرہ یوسفی صاحب کے توسط سے ہلال بھائی کی محبتوں کا نذرانہ ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد اکتوبر کا شمارہ ملا، کور پیج پر حیدرآباد ہائی کورٹ کی تاریخی عمارت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمکتی ہوئی نظر آئی۔ اداریہ میں ڈاکٹر محمد محامد ہلال صاحب نے اخوت، محبت، بھائی چارگی کے پیغام کے ساتھ اس ضمن میں حکومت کو اپنی ترجیحات طے کرنے کا مشورہ دیا ہے، کہ ہمیں جس چیز کی ابھی زیادہ ضرورت ہے اس پر پہلے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں گاندھی جی کے حوالے سے مضامین وسمینار کے تعلق سے گفتگو کے علاوہ ذات مصطفیٰ، اسوۂ مصطفیٰ، نعت نبی وغیرہ پر مضامین پڑھ کر تارِ حیات نغمہ سرائی کرنے لگا۔ چوں کہ رسالہ ایسے وقت میں ملا جب میلاد مصطفیٰ کی آمد آمد ہے۔ مصطفیٰ کے بعد نواسۂ مصطفیٰ کی مناسبت سے احمد نورعینی صاحب کا مضمون ''اقبال فہمی'' پڑھ کر دل کے دریچے کھل اٹھے اور طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ انہوں نے بہت ہی عمدہ اور اچھے انداز میں بتایا کہ حسین کس شخصیت کا نام ہے، جس تلمیحاتی اور استعاراتی انداز میں احمد صاحب نے ذات حسین کو پیش کیا ہے یقیناً وہ لائق تحسین وتبریک ہے۔ عامل بدایونی کا مضمون 'کگرالہ میں نعت گوئی کی روایت' پڑھ کر اچھا لگا، انہوں نے بہت ہی اچھے انداز میں کگرالہ میں نعت گوئی کی تاریخ ضبط تحریر میں لایا ہے۔ مضمون بہت ہی مفصل اور معلوماتی ہے جو قاری کو نعت گوئی اور عشق رسول ﷺ کی طرف مائل کرتا ہے۔ صدائے شبلی کے تمام اراکین وذمہ داران کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور خاص کر ایڈیٹر ڈاکٹر محمد محامد ہلال صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اردو ادب میں مرثیہ اور اور نعت گوئی پر اب اتنی توجہ نہیں دی جارہی ہے جتنا کہ اس کا حق ہے اور چنندہ رسالوں اور ادبی ماہناموں میں اس پر مضمون وغیرہ لکھے جاتے ہیں، لیکن ڈاکٹر موصوف اور ان کی کاوشوں سے صدائے شبلی اس جانب اپنی پیش رفت جاری رکھے ہوئے ہے جو کہ ایک نہایت نیک اور خوش آئند بات ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آگے بھی یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا جیسا کہ آئندہ ذات رسولؐ اور صفات رسولؐ پر سمینار منعقد ہونے جارہا ہے اور وہ بھی نثری ادب کے حوالے سے جو کہ اپنے آپ میں ایک نئی پہل ہے۔ میں اس کے لیے ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر جرار احمد۔ شعبۂ تعلیم وتربیت، مانو، حیدرآباد

☆ محترم ڈاکٹر جرار احمد صاحب! آپ نے ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے مختلف مضامین پر معیاری تبصرہ کیا ہے۔ آپ کے گراں قدر تبصرے سے یقیناً ''صدائے شبلی'' کے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ نہ صرف رسالے کے لیے خطوط اور مضامین ارسال کریں گے بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دیں گے۔ صدائے شبلی کے لیے خط لکھنے اور اسے پسند کرنے کا بیحد شکریہ۔

لفظوں کا لہو

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا اس لیے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دو عدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

نام کتاب: لفظوں کا لہو

مصنف: سلمان عبدالصمد

مبصر: عبدالستار اصدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ناول "لفظوں کا لہو" پر چند سطری تبصرہ سے قبل یہ عرض کردوں کہ گزشتہ سال جب ناول کی اشاعت بھی نہیں ہوئی تھی اور سلمان عبدالصمد پی ڈی ایف فائل سب کو بھیج رہے تھے درخواست کے بعد مجھے بھیج دیا، لیپ ٹاپ پر پڑھنا میرے لیے دشوار تھا سو نہیں پڑھ سکا اور متعدد بار سلمان سے ہارڈ کاپی کی درخواست کی تھی ان سے نہیں بک پر اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ ادھر پٹنہ میں اجرا ہوا اور ادھر پہلے ایڈیشن کی کاپی ختم ہوئی، اس لیے بہت دنوں بعد کاپی ہاتھ آئی اور پڑھنا شروع کیا۔ بہت شوق سے ناول لے کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ ایک نشست میں تقریباً 82 صفحات پڑھے مگر ذہن بوجھل تھا، آگے بڑھنے کو بالکل ہی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کئی سوالات دل میں تھے۔ سب سے زیادہ ناول کا بکھراؤ عجیب محسوس ہو رہا تھا، کہانی کا کوئی اصل سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اس پریشانی سے نکلنے کے لیے سلمان عبدالصمد کو فون کیا کہ مجھے ناول پر آپ سے بات کرنی ہے۔ انھوں نے کہا کہ 80-80 صفحے ہی آپ نے پڑھے ہیں تو اس لیے اس پر کوئی بات نہیں ہوسکتی ہے۔ آپ آگے پڑھنا چاہتے ہیں تو پڑھیں، ورنہ چھوڑ دیں۔ اس مکالمے کے بعد میں نے ناول اٹھا کر رکھ دیا کہ اب نہیں پڑھنا ہے لیکن چند دنوں کے بعد خیال آیا کہ کیوں نہ مکمل کرلیا جائے، جبر کے ساتھ ہی سہی۔ میں نے ایک رات دوبارہ ناول پڑھنا شروع کیا اور تقریباً 160 صفحات تک پہنچا تو میرے دل میں اٹھنے والے بہت سے سوالات غائب ہونے لگے اور میں نے سلمان کو فون کرکے کہا کہ بہت سے سوالات کے جواب مجھے ملنے لگے۔ بھائی آپ نے تو 'غالب' کی طرح خیالات ادھورے چھوڑ دیے۔ انھوں نے بس اتنا کہا کہ مکمل پڑھیں اس کے بعد بات کرنا مناسب ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ وہ علی گڑھ بھی آئے اور میں نے ناول کے چند صفحات انھیں دکھائے، مگر انھوں نے اس وقت بھی کچھ زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں کی، مگر جب تکمیل کے بعد ان کو کال کی تھی تو میں بس یہی کہہ سکا کہ میرے تمام سوالات کے جوابات مل گئے۔

بکھرا بکھرا نظر آنے والا ناول ایک مربوط تحریر کا احساس دلا گیا جو ہم دونوں نے پڑھتے پڑھتے کال ڈسکنکٹ کردی۔

ہر قلم کار کا ایک جداگانہ طریقہ ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ایک ذاتی انفرادیت ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے احساسات و جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کوئی قلم کار اپنے معاشرے سے ہٹ کر کچھ تحریر نہیں کرسکتا، کوئی قلم کار اپنی انفرادیت سے اجتناب نہیں کرسکتا۔ سلمان عبدالصمد کا ناول "لفظوں کا لہو" ان کی ایک عمدہ مثال ہے۔ سلمان عبدالصمد نے گاؤں کی زندگی کو دیکھا ہے اور شہر کو بھی۔ وہ ان میں لکھنے والے اخباروں کو بھی جانتے ہیں اور وہاں کے حالات سے بھی واقف ہیں، جس کا اندازہ ناول کے پہلے ہی جملے سے ہوجاتا ہے۔

"ہمیں چاہیے لفظوں کی آزادی"

ناول کے ابتدائی مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ یہ سیاسی ناول ہے اور ایک نوجوان نے جذبات میں بہہ کر اپنے قلم کو جنبش دی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس میں وہی مضامین ہوں گے جو ہر دن ٹی وی اور اخبارات کی زینت بنتے ہوئے ہیں۔ یہ کچھ ایسا نہیں کہ جس کا مطالعہ کرکے کوئی علم میں اضافہ ہو یا کوئی ایسی بات جاننے کو ملے جس سے قاری اب تک واقف نہیں تھا۔ اس لیے ایک لمحہ یہی چاہتا ہے کہ ناول کو اٹھا کر پھینک دیا جائے، لیکن جب ذرا آگے بڑھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ناول کا اصلی چہرہ وہ نہیں ہے جو ابتدا میں نظر آتا ہے بلکہ ناول کی حقیقی شکل کچھ اور ہے۔ لیکن قاری کو ایک بار پھر یہ

احساس ہوتا ہے کہ ناول کو طول دینے کے لیے ناول نگار نے ناول میں بے مطلب کہانیوں کا اضافہ کیا ہے اور ناول بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ورنہ اس قدر کرداروں کا ہونا ایک ناول میں کیا ضروری ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ وہ کردار جس سے قاری کو الجھن ہوتی ہے، جس کو وہ مرکزی کردار سمجھتا ہے، وہ مرکزی نہیں ضمنی کردار ہے۔ گویا سلمان عبدالصمد نے موتیوں کی طرح کردار کو پرویا ہے۔ شروع میں جو کردار قاری کو بے ربط محسوس ہوتے ہیں، وہ آخر میں آکر اس قدر مربوط ہوجاتے ہیں کہ ان کی تکنیک پر حیرت ہوتی ہے اور یہی کردار ناول میں طوالت کے ساتھ تجسس اور دلچسپی کا باعث بھی بنتے ہیں۔ اس ناول پر کوئی فرد اس وقت تک حتمی فیصلہ نہیں کرسکتا، جب تک وہ ناول کے حصہ سوم کا مطالعہ نہ کرلے۔ بکھراؤ کو اختتام تک اس طرح پیش کرنا دینا ہی سلمان کی جداگانہ روش اور انفرادیت ہے۔

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
AcN: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661

جامعة البنات الاصلاحیة حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دوردراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأۃ الصالحۃ" ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819